کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ جن کے بغیر زندگی بے معنی رہتی ہے۔ اور جب تک علم اور عقیدہ کا امتزاج نہ ہو صالح تمدن نہیں پیدا ہو سکتا۔ جدید تمدن کی بقا اس میں ہے کہ وہ خارجی عالم کی تسخیر کے علاوہ باطن کی دنیا کا بھی رمز شناس بنے۔

تہی وحدت سے ہے اندیشۂ غرب کہ تہذیب فرنگی بے حرم ہے

ہم نے اب تک اقبال کے فلسفۂ تمدن کا جو تجزیہ پیش کیا اس میں نظری اصول سے بحث تھی۔ اس مقالے کے دوسرے حصے میں ہم یہ بتائیں گے کہ اگر ان نظری اصول کو اداروں کا عملی جامہ پہنایا جائے تو تمدن کی کیا شکل پیدا ہو گی۔ در اصل ہر تمدن کا ایک مخصوص طریق فکر و عمل (ٹکنیک) ہوتا ہے جو اس کے سیاسی، معاشی اور صنعتی اداروں میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اقبال کے اصول تمدن کس نوعیت کے اداروں کے حریف ہو سکتے ہیں۔

(باقی)

---

۵۵ ف

بحیرۂ روم کے علاقوں
میں
عربوں کی فتوحات

از

جناب پروفیسر محمد جمیل الرحمن صاحب۔ پروفیسر تاریخ جامعہ عثمانیہ

اوراق ذیل میں مشہور جرمن مستشرق ڈاکٹر کارل ایچ۔ بیکر کے مضمون[1] کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ جو آج سے تقریباً تیس برس قبل شائع ہوا تھا۔ مضمون پڑھنے سے واضح ہوگا کہ یہ اسلامی روایات کے مطابق نہیں لکھا گیا، اور بیکر کے لئے ایسا کرنا ممکن بھی نہیں تھا۔ خود مصنف نے آغاز مضمون میں واضح کر دیا ہے کہ عہد وسطے کے یورپ میں فن تاریخ بہ تمام و کمال متقدایان کلیسا کے ہاتھ میں تھا، اور انہوں نے جس طرح چاہا اس فن کو بنایا اور بگاڑا۔ اسلام کے ساتھ مسیحیت کا سابقہ اس حالت میں پڑا کہ اسلام نے ایشیا اور یورپ میں مسیحت کو ایسی

---

[1] Die Ausbreitung der Araber im Mittelmeergebiet.

شکست دی جس سے بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ اس مذہب کا دوبارہ سنبھلنا ناممکن ہو جائے گا۔ یورپ کے باشندے جاہل تھے، اگر پڑھنے لکھنے کا فن رہ گیا تھا تو انھیں مقتدا یان مذہب میں کہیں کہیں پایا جاتا تھا۔ ان لوگوں نے اپنے وعظوں، تقریروں اور تحریروں میں انتہائی کوشش کی کہ تاریخ وعقائد اسلام بدترین صورت میں پیش کریں، تاکہ ان کے پیروؤں میں اسلام کی عزت جاگزیں نہ ہونے پائے اور شائد اس طرح نفرت کا بیج بو کر وہ مسیحیت کو بچالیں۔ اُس دن سے آج تک اسلام کے متعلق یورپ میں طرح طرح کے اوہام پھیلے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے مستشرق یورپ میں گزرے اور انھوں نے عربی زبان کی بڑی خدمتیں کیں، مگر عہد وسطیٰ میں کلیسا کے پیشوا انھیں جو کچھ سمجھا اور پڑھا چکے تھے اُسے وہ نہ بھول سکے۔ اسلام کے متعلق جب کبھی انھوں نے قلم اٹھایا تو معاندانہ طریقہ اختیار کیا، آج تک انھیں اسلام میں کوئی خوبی دکھائی نہیں دی۔ مصنف لکھتا ہے کہ چند سال سے تاریخ کلیسائی اثرات سے پاک ہوگئی ہے، اور ان اثرات کو فراموش کردیا گیا ہے۔ مگر یہ محض خیال ہی خیال ہے۔ خیال ہو سکتا تھا کہ کم از کم بیکر تو اپنے اس دعوے کا ثبوت دے گا۔ لیکن وہی خرافات یہاں بھی پائے جاتے ہیں۔ ترجمے

وہ حصے خارج کر دیے گئے ہیں جو از سرتا پا لغویات پر محمول تھے۔ لیکن اس کے باوجود ناظرین خود اندازہ کریں گے کہ بہت سی قابل اعتراض باتیں ابھی تک مضمون میں موجود ہیں۔ ممکن تھا کہ حواشی کا اضافہ کرکے ان لغویات کو کم کر دیا جاتا، لیکن خوف یہ تھا کہ پورا مضمون ہی نئے سرے سے لکھنا پڑے گا۔ اس لئے یہ ارادہ ترک کر دیا گیا۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ ان اوراق میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے مترجم اور اڈیٹر کو اتفاق ہے۔ مضمون شائع کرنے کی غرض صرف اتنی ہے کہ معلوم ہو جائے کہ اس بیسویں صدی میں بھی ایسے علمار یورپ میں موجود ہیں جو باوجود صاحب بصیرت ہونے کے اسلام کا ذکر کرتے ہیں تو اپنی بصیرت کھو بیٹھتے ہیں۔ بہرحال اس سے اتنا تو اندازہ ضرور ہوگا کہ یورپ کے ایک بڑے مستشرق کے خیالات تاریخ اسلام کے متعلق کیا ہیں۔ مصنف نے مضمون کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ مشرق کے متعلق ہے، اور دوسرا مغرب کے۔ (مترجم)

پہلا حصہ

عربوں کی استعماری جدوجہد اور ان کی فتوحات کی وجہ سے عہد وسطیٰ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ انھیں کی جدوجہد سے یورپ کی مختلف

حکومتوں کا سنگ بنیاد رکھا گیا، اور انھیں کی فتوحات سے مشرق و مغرب میں وہ اختلاف اور بعد شروع ہوا جس کے اثرات موجودہ زمانے تک باقی ہیں۔ اُس زمانے کے یہ اختلافات تمام عہد وسطےٰ میں برابر جاری رہے، اور آج کل بھی یہی اختلافات مسیحی یورپ اور اسلامی ایشیا کے درمیان سب سے بڑا اور اہم واقعہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی ابتدا اُس وقت ہوئی جب مسلمانوں نے پہلے اندلس، پھر مشرقی یورپ اور اس کے بعد ایشیائے کوچک کو اسلامی علاقے قرار دے کر عیسائیوں کو وہاں سے بالکل بے دخل کر دیا۔ گو دونوں براعظموں کا اس طرح ایک دوسرے سے دور ہو جانا اصل میں محض جغرافی حیثیت رکھتا تھا لیکن تاریخ عالم میں اس مخالفت کا آغاز ساتویں صدی عیسوی میں ہو چکا تھا۔

عہد وسطےٰ کی تاریخ یورپ کا دور درحقیقت کلیسائی دور تھا۔ اس دور میں کلیسائی مورخوں نے اسلامی اور مسیحی اختلاف کو کلیسائی سیاسیات کا جز بنا کر تصویر کا صرف ایک رُخ پیش کیا، اور انھوں نے جو کچھ لکھا وہ اہل یورپ کے دلوں پر اس طرح ثبت ہو گیا کہ اصلی تاریخی واقعات اور حالات کا مشاہدہ ان کے لئے اب تک مشکل ہے۔ اس نئی تحریک عمل یعنی اسلام کے سمجھنے میں انھیں طرح طرح کی دقتیں پیش آئیں۔ آج کل عوام کی نظر میں وہی پرانے کلیسائی نظرئے اور روایات زندہ جاوید ہیں، اور وہ لوگ اسی نظر سے تمام تاریخ پڑھتے اور لکھتے ہیں۔ ان روایات کو مختصر طور پر یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ

"اپنے پیغمبرؐ کے احکام کی تعمیل میں عربوں کی فوجیں
مسیحی دنیا پر بلائے بے درماں کی طرح نازل ہوئیں، تاکہ
اُسے تلوار کے ذریعہ سے اسلام قبول کرنے پر مجبور کریں۔ اس
واقعے کی وجہ سے قدیم زمانے کی ترقی اور تہذیب کے
تمام سلسلے بالکل ٹوٹ گئے، اور ایک نئی عربی، یا دوسرے

لفظوں میں اسلامی تہذیب کا زمانہ شروع ہوا، جس نے قدیم
مسیحی تہذیب کی جگہ لی۔ اس کی وجہ سے مشرق و مغرب میں انتہا درجے کا
اختلاف پیدا ہوا۔ صرف صلیبی جنگوں کے زمانے میں ان دونوں
براعظموں نے ایک دوسرے پر اپنا اثر کرنا شروع کیا، اور ردعمل کا دور
شروع ہوا۔"

اگر ان خیالات کا موازنہ عربی کتابوں سے کیا جائے تو وہاں بھی کم و بیش انھیں خیالات کی تصدیق ہوتی ہے۔ کیونکہ عربوں میں بھی تمام روایات کو اتنا ہی مذہبی رنگ دیا گیا ہے جتنا کہ یورپ میں۔ اس کے علاوہ ان کی روایات میں ایک اور کوتاہی یہ ہے کہ ان کے ہاں تمام دنیا کی تاریخ کا آغاز آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ابتدائی خلفاء سے ہوتا ہے ان کے نزدیک انھیں حضرات نے دنیا کو نئے سرے سے ترتیب دیا، اور اس تہذیب و تمدن کی بنا ڈالی جو اسلامی تہذیب کہلاتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ دونوں واقعات صداقت سے بعید ہیں۔ ابھی تھوڑی مدت گزری کہ تاریخی تحقیقات کا فن مذہبی روایات سے بالکل آزاد ہوا ہے۔ اب ہم واضح طور پر تاریخی تسلسل معلوم کر سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ اسلام اپنے وطن کی تنہائی سے نکل کر مشرقی۔ یونانی تہذیب و تمدن کا صحیح معنوں میں وارث بنا تھا۔ اسلام درحقیقت تاریخ عالم کے ارتقاء کی آخری کڑی ہے۔ اسکندر اعظم سے لے کر قیاصرۂ رومۃ الکبریٰ تک مشرق نے مغرب کے علم اور حکومت کے تحت زندگی بسر کی تھی۔ لیکن جس طرح قیاصرہ کے زمانے میں یونانی تہذیب کی روح مشرق کے ساتھ مل جل کر فنا ہو گئی تھی، اور جس طرح کلاسکل زمانے میں یورپ نے نہایت ذوق و شوق سے ایشیائی مذاہب اور تمدنوں کو خوش آمدید کہا تھا، بالکل اسی طرح تیسری صدی عیسوی سے مشرق میں بھی ایک ردعمل شروع ہوا تھا، اور سامی عناصر نے یونانی اثر و نفوذ کو قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔ مسیحی دنیا

میں یہ اثرات خاص طور پر ارامی اور یونانی زبان بولنے والے علاقوں کے باشندوں پر پڑ رہے تھے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو لاطینی اور یونانی کلیساؤں میں مخاصمت اور تنازعہ کا سب سے بڑا سبب یہی اختلاف تھا، کہ لاطینی کلیسا یورپ کی طرف مائل ہے، اور یونانی کلیسا کی بنیاد مشرقی اصولوں اور روایتوں پر ہے۔ عربوں کی فتوحات اور توسیع حکومت کے ساتھ اُس زمانے کے ایشیا کو ایک مرتبہ پھر پورے طور پر سیاسی خود مختاری حاصل ہوئی، مگر اس سے قبل ہی تمدنی لحاظ سے، وہ رفتہ رفتہ یورپ سے آزاد ہوتا جا رہا تھا۔ عربوں کی فتوحات سے ایشیا میں کوئی نئی چیز شروع نہیں ہوئی، اور نہ کسی ایسی بات کا آغاز ہوا جو یورپ کے عہد وسطیٰ کے لئے اجنبی ہو۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ، اگر غور سے دیکھا جائے تو، ہمیں اندازہ ہوگا کہ عہد وسطیٰ کی مسیحی اور اسلامی دنیا کے خیالات میں ایک گہرا تعلق ہے؛ اور یہ تعلق تعجب خیز بھی نہیں۔ کیونکہ تہذیب کی دونوں صورتیں ایک ہی اصل، یعنی قدیم مسیحی یونانی مشرقی تمدن کی دو مختلف صورتیں ہیں۔ عربوں نے جن ممالک کو فتح کیا ان میں سے بحیرۂ روم کے علاقوں میں اس امر کا مشاہدہ بہتر طریقے سے ہو سکتا ہے۔ لیکن چونکہ خلافت کا مرکز ثقل ہمیشہ مشرق میں رہا، اور وہاں قدیم ایشیائی روایات پر زیادہ عمل ہوا، اس لئے خالص یونانی۔ اسلامی تہذیب رفتہ رفتہ زیادہ مشرقی صورت اختیار کر لی گئی۔ دوسری طرف اگر دیکھا جائے تو وحشی جرمن اقوام کی یورش کی وجہ سے یورپ بالکل گمنامی کی حالت میں پڑ گیا، اور اس لحاظ سے وہاں بظاہر تہذیب و تمدن کا خاتمہ ہو گیا؛ کیونکہ یہ جرمن اقوام اُسے قبول نہ کر سکیں۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان اقوام نے اپنے تمدن کی عمارت انھیں قدیم بنیادوں پر کھڑی کی، اور عہد وسطیٰ کی یورپی تہذیب کو بالکل نئی شکل دے دی۔

ایک طرف تو کلیسا کے تخیل نے تاریخی تسلسل کو بالکل تباہ کر دیا اور دوسری

طرف انھیں اسلام کی اس توسیع میں صرف مذہب کی اشاعت نظر آئی اور باقی باتیں ان سے پوشیدہ رہیں۔ اس وجہ سے انھوں نے عربوں کی نقل و حرکت کو بالکل تباہ کن سمجھ لیا۔ یہ واقعہ ہے کہ مذہب اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلایا گیا تھا، بلکہ عربوں نے صرف سیاسی اقتدار کو وسیع کرنے میں تلوار سے کام لیا تھا۔ غیر عرب اقوام کے اسلام قبول کرنے کو نہ صرف بری نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، بلکہ اس میں رکاوٹیں پیدا کی جاتی تھیں۔ مفتوحہ اقوام کو اجازت تھی کہ وہ اطمینان سے اپنے قدیم مذاہب پر قائم رہیں، بشرطیکہ وہ سرکاری محاصل اور خراج باقاعدہ ادا کرتی رہیں۔ اس لئے جو لوگ اسلام قبول کرتے تھے ان کا مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ وہ ان خاص محاصل سے نجات پا جائیں، لیکن اسے حکمران قوم اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتی تھی۔ بعد کے زمانے میں چند لوگ بہت غور و فکر کے بعد دیانت داری سے تبدیل مذہب کی طرف راغب ہوئے۔ اس کی وجہ بھی صرف یہ ہوئی کہ انھوں نے دیکھا کہ مفتوحہ علاقوں میں حالات رفتہ رفتہ بہتر ہوتے جا رہے ہیں، اور لوگ بھی مادی فلاح و بہبود کی خاطر اسلام قبول کرتے جا رہے ہیں۔ مگر جو نظریہ کلیسائی مورخوں نے اختیار کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نئی تحریک یعنی اسلام کی پیدائش کے اسباب کچھ اور ہی تھے۔ عربوں کا اچانک اپنے وطن سے باہر نکلنا، اور اس کثرت سے دوسرے ممالک میں پھیل جانا بادی النظر میں ایک ناگہانی واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سینکڑوں برس سے عرب قبائل کی نقل و حرکت جاری تھی۔ یہ واقعۃً سامی اقوام کی آخری نقل و حرکت تھی، جو عرب کی معاشی تباہی کی وجہ سے واقع ہوئی، اور اسی تباہی کے ساتھ وہ وابستہ ہے۔ ہمارا یہ نظریہ ناقابل تردید ہے، بشرطیکہ ناظرین بالکل خالی الذہن ہو کر اس پر غور کریں، اور جو کچھ وہ پہلے پڑھ اور سیکھ چکے ہیں، اسے بھول جائیں۔ عیسوی سنین کے آغاز ہی میں عربوں کی نقل و حرکت کی ابتداء ہو چکی تھی۔ جنوبی عرب کے قبائل مدینے کے مالک تھے۔

اور جنوبی عرب ہی کے دوسرے قبائل شام اور میسوپوتامیا میں اپنا وطن بنا چکے تھے۔ روایات جن کی توثیق جنوبی عرب کے کتبوں سے ہوتی ہے، ان سے پایا جاتا ہے کہ جنوب میں زندگی کے حالات ہر لحاظ سے بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ اس علاقے کی سیاسی بربادی کے بعد ان بڑے بڑے تالابوں کی نگاہ داشت نہ کی جا سکی جن پر بڑی حد تک ملک کی خوش حالی کا انحصار تھا۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کچھ عرصہ قبل عرب ایک کرب و بے چینی کی حالت میں تھا، اور عرب قبائل اور گھرانوں کی نقل و حرکت ہمسایہ متمدن ممالک، یعنی ایرانی اور یونانی علاقوں کی طرف باقاعدہ طور پر شروع ہو چکی تھی، اور اسے روکا نہیں جا سکتا تھا۔ ان ممالک میں پہونچ کر یہ عرب قبائل اُن سامی اقوام، یعنی ارامی لوگوں میں مل جل جاتے تھے، جو مدتوں پہلے یہاں آباد ہو کر ان ممالک کی آبادی کا ایک جز' بن چکے تھے۔ ایرانیوں اور بازنطینوں کو اپنے سرحدی صوبوں پر اس مستقل بے چینی اور ہل چل سے مشکلات کا احساس ہوا اور دونوں حکومتوں نے کوشش کی اس نقل و حرکت کو باقاعدہ طور پر منظم کر دیں، اور اس سے ایک دوسرے کے خلاف جنگ و جدل میں کام لیں۔ چنانچہ یونانیوں نے شام و عرب کی سرحد پر غسانی حکمرانوں کے تحت ان منتقل ہونے والے عربوں میں ایک تنظیم پیدا کرائی، اور مشہور غسانی حکمرانوں کو بطریق کا خطاب تک دے دیا۔ دوسری طرف ساسانیوں نے حیرہ میں ایسی ہی سد تیار کی، جہاں لخمی حکمران ایرانی سیادت کے تحت بہت مشہور ہوئے، اور عرب شعرا نے ان کی جود و سخا کی تعریف سے ان میں اور بھی چار چاند لگا دئے۔ سیاسی کوتاہ نظری اور غالباً اندرونی کمزوری کی وجہ سے یہ دونوں منتظم حکومتیں، یعنی حیرہ اور غسان، جو اسلامی افواج کے فاتحانہ سیلاب کی مدافعت کر سکتی تھیں، اسی نازک زمانے کے قریب بالکل ختم ہو گئیں۔ غسانیوں کی زبردست سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گئی، اور

ہر و ل عزیز لخمی حکمرانوں کی جگہ جلدی جلدی بدلنے والے حاکموں نے لے لی۔ ان کی تباہی کے بعد عربوں کی جو چھوٹی چھوٹی ریاستیں رہ گئیں ان میں ہمہ گیر حکومتیں قائم کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ لیکن پرانی روایات زندہ رہیں۔ سرحدی عرب مسلسل ایرانی اور یونانی جنگوں کی وجہ سے بدستور ہمسایہ متمدن ممالک پر بلا روک ٹوک حملے کرتے اور انھیں لوٹتے کھسوٹتے رہے۔ انہیں کی روایات کو، ان لوگوں نے جو اب رفتہ رفتہ نئے عربوں کے جھنڈے تلے جمع ہوتے جا رہے تھے، اپنے ہاتھ میں لیا۔ جس کام کو ان کے پیشرو نیم دلی سے کر رہے تھے، اسی کو ان عربوں نے، نئی قائم شدہ خلافت کے زیر اثر، اور اسی کے حکم کے مطابق، نہایت تن دہی سی شروع کیا، اور اسے آگے بڑھایا۔ اس سے معلوم ہوگا کہ شرقیین کی توسیع اور فتوحات درحقیقت اُس عمل کا خاتمہ تھا جو صدیوں سے رفتہ رفتہ جاری تھا۔ تبلیغ اسلام کے ساتھ اس عمل کا صرف نام بدل گیا، کیوں کہ اب جنگ میں اور اس کے آغاز کرنے میں تنظیم پیدا ہوگئی، مذہبی اور نسلی شکل اسے دی گئی، اور اس واقعے سے ایسے نتائج پیدا ہوگئے جن کا گمان بھی نہ تھا۔ ایک اور تبدیلی یہ ہوئی کہ تاریخی مفہوم بھی بدلا، اور حیرہ اور غسان کی فاصل ریاستوں کا نام و نشان تک مٹ گیا۔

اس بیان سے واضح ہوگا کہ عرب قبائل کی اس صحرا نوردی کو اسلام سے وابستہ قرار دینا کتنی بڑی غلطی ہے۔ لیکن یہ سوال ضرور کیا جا سکتا ہے کہ تمام نقل و حرکت تبلیغ اسلام کے بغیر بھی ممکن تھی یا نہیں؟ اسلام کی تبلیغ جس سُرعت سے ہوئی اس سے ہر حالت میں یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔ مذہبی اخوت کے وہ زبردست تعلقات، جنھوں نے آج کل تمام اسلامی دنیا کی شیرازہ بندی کر رکھی ہے، اور وہ مخصوص مذہبی روح جو اسلامی دنیا میں پیدا ہوئی، اس نے عربوں کی صحرا نوردی کو ایک خاص سیاسی اور تمدنی شکل دے دی۔ اگر عربوں میں اخوت اور اتحاد پیدا نہ کر دیا جاتا تو

نو مفتوحہ ممالک میں ان کا جینا ناممکن ہو جاتا ۔ اس نقل و حرکت میں اسلام کی اہمیت یہ ہے کہ اُس نے اس تحریک کو زبردست سیاسی تحریک بنا دیا، جس سے اس وقت تک دنیا کو سابقہ پڑ رہا ہے۔ شروع میں اسلام سے مطلب وہ حکومت تھی جس کا مرکز مدینہ تھا۔ لیکن اس کے بعد اسلام سے مراد عربیت لی جانے لگی؛ یعنی اس کی تبلیغ شروع ہوئی کہ عرب ہر حالت میں دنیا کے تمام باشندوں سے ارفع و اعلیٰ ہیں۔ ان عظیم الشان خیالات کے تحت اِس بے چین صحرا نوردی کو ایک روحانی اور عقلی ثبات حاصل ہوا؛ اور تمام تحریک کی بنیاد مذہب پر رکھ دینے سے ایک زبردست عربی سلطنت ظہور پذیر ہوئی، جس کا سیاسی مرکز مدینہ تھا۔ وہ چیز مذہب نہیں تھی جس نے عربوں کو ان کے وطن سے نکالا، بلکہ قحط اور حرص و آز تھی جس نے انھیں اس پر مجبور کیا۔ لیکن اسلام نے انھیں اتحاد اور مرکزیت عطا کی، جس کے بغیر اس وقت ان کا زندہ رہنا ناممکن تھا۔ اس طرح مذہب نے شرقین کو اصلی اور حقیقی معنوں میں مدد دی، اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان کے سامنے ایک سیاسی نصب العین پیش کر دیا۔ تحریک مدتوں سے جاری تھی، اسلام نے اُسے اتحاد اور تنظیم عطا کر دی۔ عربوں کا وہ سیلاب جو اس سے قبل متمدن ممالک میں رفتہ رفتہ اپنی جگہ پیدا کر رہا تھا، اب اس نئے سیلاب سے دوچار ہوا جو اسلام کی وجہ سے پیدا ہوا تھا، اور نئے اور پرانے سیلابوں نے مل کر ایک بے پناہ دریا کی شکل اختیار کی جس کا کوئی مقابلہ نہ کر سکا۔ دنیا کو اچانک معلوم ہوا کہ قدیم سلطنتیں اور تمدن تباہ ہو کر ایک نئی تنظیم اور زبردست حکومت قائم ہو چکی ہے۔

مذکورۂ بالا تمہید کے بعد شرقین کی اُس مسلسل توسیع کا بیان کرنا آسان ہو گا جو عہد وسطیٰ کے مختلف ممالک میں ممکن ہوئی۔ اس کے لئے ہم ان تمام واقعات پر ایک نظر ڈالینگے جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے فوراً بعد ظہور پذیر ہوئے، اور جن کی وجہ سے عربوں کے وطن سے باہر نکلنے پر تاریخ عالم میں اتنا بڑا انقلاب واقع ہوا۔

روایات کے مطابق آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات ایک حیرت انگیز واقعہ

تھا، جسے تمام مسلمان ناممکن سمجھتے تھے، حالانکہ خود آپؐ بار بار اعلان فرما چکے تھے کہ اور انسانوں کی طرح آپؐ کی وفات کا بھی ایک دن مقرر ہے۔ آپؐ نے اس کا فیصلہ نہیں فرمایا کہ آپؐ کے بعد کیا طرز عمل اختیار کیا جائے، اور نہ آپؐ نے کوئی قاعدہ یا قانون اپنے جانشین کے متعلق عطا فرمایا تھا، جس سے اس امر کا فیصلہ ہو سکے۔ لیکن بہر حال تمام مسلمانوں کی نظریں آپؐ کے قریب ترین اور عزیز ترین صحابہ پر تھیں، جو آپ سے مدتوں سے واقف تھے، اس لحاظ سے اُن کی نگاہیں عقیل و فہیم صحابہ، جیسے حضرت ابوبکرؓ، اور قابل حکومت صحابہ، جیسے حضرت عمرؓ پر تھیں، کہ ان حضرات سے انھیں فیصلے میں مدد ملے گی۔ ان دو حضرات کا ایک اور صحابی حضرت ابو عبیدۃ الجراح کے ساتھ اتحاد عمل بہت ہی مبارک ثابت ہوا۔ اس اتحاد نے فوری پیش آنے والے حادثہ کی روک تھام کر لی۔ اور یہ معلوم ہو گیا کہ ان کا اثر عام مسلمانوں پر اتنا ہے کہ وہ اس کام کے لئے بہترین ثابت ہوں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت ایسی ہی زبردست شخصیتوں کی ضرورت بھی تھی۔ کیونکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانشینی کا مسئلہ بہت ہی اہم مسئلہ تھا۔ بدترین قسم کی مشکلات خود مدینہ میں موجود تھیں، جن سے عہدہ برآ ہونا ضروری تھا۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات مبارک کی وجہ سے انصار کی آپس کی دشمنی اور مخالفت بظاہر ختم ہو گئی تھی اور اس کے علاوہ مہاجرین و انصار میں جو مخالفت اور منافرت مخفی تھی وہ بھی آپؐ ہی کی وجہ سے دبی ہوئی تھی۔ اُس پر قابو پانا اشد ضروری تھا۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات، عوام کے لئے، بالکل اچانک واقع ہوئی، اور جوں ہی یہ خبر پھیلی تو دونوں فریق ایک دوسرے کے خلاف جم گئے۔ ہر فریق نے آپؐ کی جانشینی کا دعویٰ شروع کیا۔ خبر ملتے ہی خزاج، جن کی تعداد انصار میں زیادہ تھی، سقیفۂ بنو ساعدہ میں جمع ہوئے۔ اس کی اطلاع اُس نے، جو قدیم مخالفت اور جنگ و جدل کے دوبارہ

شروع ہو جانے سے ڈرتے تھے، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ الجراح کو دی۔ یہ تینوں حضرات فوراً وہاں پہونچے، تاکہ مسلمانوں کو اختلاف کی مصیبتوں سے بچا لیں، اور واقعہ یہ ہے کہ عین وقت پر پہنچے۔ گرم مزاج حضرت عمر اس وقت بھی اپنی تیزی اور غصّے کی وجہ سے شائد تمام کام بگاڑ دیتے، لیکن عین اسی وقت حضرت ابوبکرؓ آگے بڑھے اور انھوں نے معاملے کو روبراہ کیا۔ یہی ابوبکرؓ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سب سے پرانے اور معمر صحابی تھے۔ آپ نے انصار کو یاد دلایا کہ مہاجرین نے اُن سے کیا سلوک کیا ہے اور یہ کہ قریش میں سے کسی کو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا جانشین منتخب کرنے سے انھیں کیا کیا فائدے پہونچیں گے۔ انھوں نے اس منصب کے لئے حضرت عمرؓ یا حضرت ابوعبیدہ کو پیش کیا۔ لیکن یہ تجویز قابل قبول ثابت نہ ہوئی، اور بحث مباحثے نے طول کھینچا۔ اسی وقت حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کا ہاتھ پکڑ کر ان سے بیعت کر لی اور دوسروں نے آپ کی پیروی کی۔ اس دوران میں سقیفہ اور اس کے سامنے کا حصہ لوگوں سے بھر گیا تھا۔ یہ لوگ ہر دو مقابل گروہوں سے بے تعلق تھے، اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے آخری عہد میں عرب کے مختلف حصوں سے مسلمان ہو کر مدینہ میں جمع ہو گئے تھے۔ انھیں خصوصیت کے ساتھ اس کی ضرورت تھی کہ حالات حسب دستور سابق باقی رہیں۔ چنانچہ انھیں لوگوں نے اس بیعت کے واقعہ کو مکمل بنانے میں سب سے زیادہ مدد دی۔ اسی طرح حضرت ابوبکرؓ مسلمانوں کے حکمران منتخب ہوئے۔

دوسرے دن بیعت عامہ ہوئی۔ مسلمانوں نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر صرف آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلیفہ (جانشین) کی حیثیت سے بیعت کی تھی۔ اس وقت خلیفہ کا کوئی لقب نہ تھا، بلکہ اُس خدمت کا نام تھا جو حضرت ابوبکرؓ کے سپرد ہوئی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کے جانشین حضرت عمرؓ نے امیر المومنین کا معنی خیز لقب اختیار کیا تھا۔

حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب بلاشک وشبہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے ایک آیۂ رحمت

ہوا۔ لیکن یہ انتخاب ان حلقوں میں جو آنحضرت سے نزدیک تر تھے، خلاف توقع سمجھا گیا۔ سب نے یہ محسوس کیا کہ انصار کسی طرح بھی کامیاب نہیں ہو سکتے، اور یہی ان کی ناراضگی کا باعث ہوا۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خود اہل بیت اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خاص الخاص صحابہ کو اس پر راضی ہونا ہی پڑا۔ کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ مخالفت بے اثر رہے گی۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے داماد، اور آپ کے نواسوں حضرت امام حسنؓ اور امام حسینؓ کے والد ماجد، حضرت علیؓ ابھی تک اسلامی سیاسیات میں پیش پیش رہے تھے۔ انھیں اب اچانک یہ محسوس ہوا کہ وہ صف اول میں نہیں رہے۔ حضرت علیؓ کے جانب دار اُن کے چچا حضرت عباسؓ اور ان کے علاوہ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیر تھے۔ حضرت علیؓ بہادر سپاہی ضرور تھے، لیکن وہ بڑے بڑے کام ہاتھ میں نہیں لے سکتے تھے اور نہ کسی معاملے کے متعلق فوری فیصلہ کر سکتے تھے [!]۔ وہ اور اُن کے طرفدار اُس وقت اس وجہ سے اور بھی کچھ نہ کر سکے کہ وہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تجہیز و تکفین میں مشغول تھے، اور باہر اس کا فیصلہ ہو رہا تھا کہ آپؐ کا جانشین کون ہو۔ حضرت ابو بکرؓ کے انتخاب کی خبر سن کر وہ ہوشیار ہوئے۔ بہرحال اب حضرت ابو بکر کی حکومت بالکل مستحکم ہو چکی تھی، اور نئی سلطنت کی نباہی صرف اسی حالت میں ممکن تھی کہ فریق مخالف متحد ہو کر دشمنی پر تل جائے۔

آنحضرت کی وفات نے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی پیدا کی ہوئی مرکزیت کو آزمائش میں ڈال دیا تھا، اور اندیشہ تھا کہ یہ مرکزیت بالکل پاش پاش نہ ہو جائے۔ مسلمان مورخوں کے مطابق آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات تک تمام عرب فتح ہو کر مسلمان ہو چکا تھا۔ آپؐ کی وفات کی خبر سُن کر بہت سے قبائل اسلام سے پھر گئے، اور متعدد خون آشام جنگوں کے بعد انھیں دوبارہ مطیع اور مسلمان کیا گیا۔ اس واقعے کو مسلمان مورخ رِدّہ کہتے ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی وفات تک

عرب پوری طرح متحد نہیں ہوا تھا۔ حجاز اور اس کے ساتھ عرب کا مغربی صحرا مع جنوبی علاقوں کے محض سیاسی لحاظ سے مدینہ اور مکہ کے ساتھ متحد تھا، اور یہ اتحاد صرف ذاتی مفاد تک محدود تھا۔ وسط عرب کے قبائل، جیسے غطفان، باہلہ، طے اور اسد نے وقتی طور پر اسلام قبول کر لیا تھا۔ شمال جیسے یمامہ کے قبائل خود اپنے ایک ہم وطن نبی کے پیرو تھے، اور جنوب و مشرق میں یا تو مرکز سے تعلقات ہی پیدا نہیں ہوئے تھے، اور یا ہوئے تھے تو خاص خاص اور متفرق قبائل سے تھے، جن کی تعداد میں کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ بعد کے زمانے میں، جب عرب مورخوں نے اپنی کتابیں لکھنی شروع کیں، تو ان کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے بعد ہی اس قدر خون آشام جنگوں کی ضرورت کیوں ہوئی؛ اور انھوں نے اسے اس طرح سمجھایا کہ اس وقت ردہ سے یہ خاص حالات پیدا ہو گئے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات ان تمام واقعات کا سبب ضرور تھی جو قبائل اسلام کے زیر سیادت آ گئے تھے وہ آپؐ کی وفات کے بعد ان تمام معاہدوں کو کالعدم سمجھنے لگے تھے جو انھوں نے آپؐ سے کئے تھے۔ لیکن وہ بے شمار قبائل جنھیں اہل الردہ کہا جاتا ہے، ان میں سے اکثر ایسے بھی تھے، جو نہ تو کبھی مسلمان ہی ہوئے تھے، اور نہ کسی زمانے میں اسلامی حکومت کے زیر سیادت آئے تھے۔ اب سمجھ میں آسکتا ہے کہ عربوں کی سیاسی توسیع کو تاریخی طور پر سمجھنے کے لئے اہل الردہ اور ان کے خلاف جنگوں کو خیال میں رکھنا کیوں ضروری ہے۔ انھیں جنگوں سے قدرتی طور پر ضرورتاً مدینہ کی قابل تعریف قیادت کے تحت فاتحانہ مہیں اور وہ کارنامے شروع ہوئے جن کا خود عربوں کو بھی کبھی خیال تک نہیں آسکتا تھا۔

عربوں میں نقل مکان کرنے کی جو تحریک مدتوں سے شروع ہو چکی تھی اُس میں

مدینہ کے سیاسی مرکز اور حکومت قائم ہو جانے سے اور سرعت پیدا ہو گئی جو خود آنحضرت کے غزوات نے بہت سے عربوں کو اس طرف متوجہ کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ عرب میں مخالفین کی تعداد اب بہت ہی کم ہو گئی تھی۔ آپؐ کی عظیم الشان مثال بھی لوگوں کے سامنے تھی۔ سوال یہ تھا کہ جو کچھ مکّے کا نبیؐ کر سکتا ہے کیا وہی بنو حنیفہ اسد یا تمیم کا نبی نہیں کر سکتا؟ چنانچہ آپؐ کی دیکھا دیکھی عرب کا ملک نبیوں کا ایک اکھاڑا بن گیا۔ اس سے ایسی صورت پیدا ہو گئی کہ کسی وقت جنگ کی آگ بھڑک سکتی تھی۔ آپؐ کی اچانک وفات نے اس تفریق و انتشار کی تحریک کو کہ ہر قبیلہ میں ایک نبی ہو بالکل نمایاں کر دیا۔ اس تمام تحریک کا ردِ عمل قدرتی طور پر ہم عصروں کی نظر سے پوشیدہ تھا۔ تمام عرب اس قسم کے انتشار میں مبتلا ہی تھا کہ اہل الردہ نے مدینہ کی حکومت کو زبردست اقدام پر مجبور کیا، اور آخر یہی حکومت اسے ختم کرنے میں کامیاب ہوئی۔ رِدّہ کی جنگ درحقیقت ان لوگوں کے خلاف تھی، جنھوں نے مدینہ کو خراج ادا کرنے سے انکار کیا تھا۔ یہ جنگ عرب کی سیاسی حکومت کے قیام سے تعلق رکھتی تھی، اور اس طرح اُسے سیاسیات کا ارتقا سمجھنا چاہیے جو واقعات بیان کئے گئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ عرب کے مختلف عناصر کو مرکز سے پوری طرح وابستہ کرنے کے لئے یہ ضروری اور لابدی جنگ تھی۔

انتخاب کے بعد بہت ہی تھوڑے سے قبائل، بلکہ صرف ان قبائل نے جو مدینہ سے وابستہ تھے، حضرت ابو بکرؓ کی حکومت تسلیم کی۔ باقی تمام قبائل اس تحریک سے الگ ہو گئے۔ رِدّہ کی خبر مدینہ پہونچنے سے قبل، ایک فوج جسے خود آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تیار کیا تھا، موتہ کی شکست کا بدلہ لینے کی غرض سے شامی سرحد کی طرف جا چکی تھی [؟] اس لئے مدینہ اس وقت فوج سے بالکل خالی تھا۔ منحرف شدہ قبائل میں سے بعض نے اس نازک موقع سے فائدہ اٹھا کر مدینہ پر

ایک ضرب کاری لگانی چاہی ۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے بڑی مستعدی سے کام لیا۔ مسلمانوں کی خوش قسمتی سے فوجی مہم عین وقت پر مدینہ واپس آگئی، اور اسے فوراً باغیوں کے خلاف ذوالقصہ روانہ کر دیا گیا۔ (اگست ۔ ستمبر ۶۳۲ء)۔ اب حضرت خالد بن ولید کو جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی ہی میں مشہور ہو چکے تھے، حکم دیا گیا کہ وہ وسط عرب کے قبائل کی مخالفت کا خاتمہ کر دیں۔ خالدؓ بن ولید بلا شک وشبہ دنیا کے بہترین سپہ سالار تھے، اور وقت پر بے رحمی سے بھی کام لے سکتے تھے۔ فن حرب کو وہ خوب سمجھتے تھے، اور جو کمی باقی تھی وہ ان کی مستقل مزاجی، ثابت قدمی اور تہور نے پوری کر دی تھی، جس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ درحقیقت خالدؓ بن ولید ہی ردّہ کے اصلی فاتح ہیں، اور انھیں کی سپاہیانہ قابلیت نے ایک فتح سے دوسری فتح کی طرف اسلام کی رہنمائی کی۔

بہت جلد حضرت خالد بن ولیدؓ نے تقریباً چار ہزار فوج کے ساتھ قبیلۂ طے کو دوبارہ مطیع کیا، اور بُزاخہ کے مقام پر اسد اور غطفان کی مزاحمت کو بالکل زیر و زبر کر دیا ۔ یہ قبائل طلحہ بن خویلد نام ایک نبی کے پیرو تھے، جسے مسلمانوں نے حقارت سے مصغر کر کے طلیحہ کر لیا ہے، اور اس کے جھنڈے تلے جمع ہوئے تھے ۔ یہ زبردست کامیابی صرف خالد بن ولید ہی کی وجہ سے ہوئی ۔ اب وہ ان انصار کی مرضی کے خلاف، جو ان کے ساتھ تھے، اور خلیفہ کے حکم کے بغیر آگے بڑھے، اور بنو تمیم کے علاقے میں داخل ہوئے ۔ ان کا یہ خود مختارانہ طرز عمل اور بے رحمانہ ذاتی انتقام ہی بذات خود اس قابل تھا کہ انھیں واپس بلا لیا جاتا۔ لیکن اس کے بجائے نہ صرف یہ طرز عمل حق بجانب قرار دیا گیا، بلکہ ان کی یہ تجویز بھی منظور کر لی گئی کہ یمامہ میں بنو حنیفہ پر ایک ضرب کاری لگائی جائے ۔ یہاں ایک نبی مسلمہ حکمران تھا، جسے مسلمان طلیحہ کی طرح حقارت سے مسیلمہ کہتے ہیں۔ اس

مسیلمہ نے آنحضرتؐ کی نقل میں اپنے آپ کو نبی کہلانا شروع کیا تھا۔ وہ کسی لحاظ سے بھی، خواہ مذہبی ہو یا سیاسی، مدینہ سے وابستہ نہیں تھا، لیکن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک نقال ضرور تھا۔ بہرکیف اس کی حکومت بظاہر مستحکم تھی، اور حضرت خالد بن ولیدؓ کو یہاں بہت خون ریز جنگ پیش آئی، تب کہیں وہ مسیلمہ کی طاقت توڑ سکے۔ یہ قابل یادگار اور بلاشبہ ردہ کی مشہور ترین جنگ عقربا، کے مقام پر لڑی گئی۔ ان واقعات کے سنین کا یقین کے ساتھ تعین کرنا محال ہے۔ لیکن اندازہ یہ ہے کہ جنگ عقربا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے تقریباً ایک سال بعد واقع ہوئی تھی۔

حضرت خالد بن ولیدؓ کی انھیں کامیابیوں کے بعد بظاہر دوسرے سپہ سالار بھی بحرین، عمان، مہرہ، حضرت موت اور یمن سے واپس آئے۔ یہ درحقیقت ان علاقوں کی یہ پہلی فتح اور اطاعت تھی۔ لیکن اسلام کی یہ سب فتوحات ان فوجوں کی طرف سے نہیں ہوئیں جو خاص طور پر مدینہ سے بھیجی گئی تھیں، اور یہ بھی مشتبہ ہے کہ جن سپہ سالاروں سے یہ فتوحات منسوب کی گئی ہیں وہ مدینہ سے بھیجے گئے تھے۔ غالباً ان کی فتوحات کو بعد میں قانونی درجہ دے دیا گیا۔ مہاجر بن ابی امیہ اصلی معنوں میں خلیفہ کے سب سے پہلے نمایندہ تھے۔ بہرکیف اس وقت جب مسلمانوں کی فوجیں شام و عراق میں لڑ رہی تھیں تو یہ علاقے مدتوں تک بدامنی اور بے چینی کا مرکز بنے رہے۔ اس کے علاوہ یہ سب علاقے پچاس برس کے اندر اندر دوبارہ تقریباً خودمختار ہو گئے۔ زمانۂ مابعد میں یہی علاقے ان تمام فرقوں کا ملجا و ماوی بن گئے جن کا مقصد مسلمانوں کی مخالفت تھا۔

جنوبی عرب کی یہ جنگیں نہیں تھیں، بلکہ درحقیقت حضرت خالد بن ولیدؓ کے بے مثال فاتحانہ کوچ، اور شامی سرحد پر مختلف قسم کی ابتری اور اضطراب وہ دو چیزیں تھیں جنھوں نے

مل جل کر واقعات کی رفتار مشخص کی۔ وسط عرب کی فتح سے جسے اب مدینہ کی مرکزی حکومت نے بالکل مکمل کر دیا تھا، سرحدی عرب اس حکومت سے بہت مرعوب ہو گئے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ عرب کے زبردست اور طاقتور قبائل میں جنگ کی روح بھی تازہ ہو گئی تھی۔ حکومت مدینہ کے سامنے اس وقت بڑا اہم مسئلہ یہ تھا کہ عرب جیسے بنجر اور بے آب و گیاہ ملک کے بے چین باشندوں کو اسلام کی قائم کی ہوئی امن الٰہیہ میں رہنے پر مجبور بھی کریں، اور ساتھ ہی ان کے بے دخل کئے بغیر انھیں قبائلی جنگوں اور عناد و فساد سے بھی روکے رکھیں، تاکہ حکومت کی سرحدیں بھی آیندہ خانہ جنگیوں سے محفوظ رہیں۔ توقع یہ تھی کہ حضرت خالد بن ولید کی فوج کی واپسی پر ان نومفتوحہ قبائل میں مدینہ کے خلاف ایک زبردست ردّعمل شروع ہوگا، اور ضرورت اس امر کی تھی کہ ایک طرف تو اس فارغ فوج کو مشغول رکھا جائے، اور دوسری طرف ان نومفتوحہ قبائل کو نئی صورت حال سے روشناس اور مانوس کیا جائے۔ یہی دو باتیں اسلامی حکومت کی توسیع کا باعث ہوئیں، اور یہی اس کا سبب ہوئیں کہ مسلمان عرب کی سرحد پار کر کے دوسرے ممالک میں داخل ہوئے۔ سنین کے اعتبار سے ایرانی حکومت کے صوبۂ عراق پر اسلامی حملہ ان واقعات کے سلسلے کی پہلی کڑی تھی۔ لیکن یہ حملہ درحقیقت ایک بالکل ہی بے قاعدہ مہم تھی۔ اسلامی حکومت کی نظر شام پر تھی، اور اس کا حقیقی مقصد بھی اُسی سمت میں بڑھنے کا تھا۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم ان واقعات پر توجہ کریں ہمیں اس کا تعین کرنا پڑے گا کہ آیندہ ہم جو کچھ کہیں گے اُس میں ہمارے اسناد اور واقعات کی کیا قدر و قیمت ہے، تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ہم عصر لوگوں کے مطابق ان تمام واقعات کی ترتیب کیا تھی، اور عرب حکومت کی توسیع میں ان کا کیا حصہ تھا۔ شرقین کی فتوحات کچھ مدت سے بڑے بڑے علماء کے زیر بحث رہی ہے۔ دخویہ، ولہاؤسن اور میدانی کوس کی علمی تحقیقات نے

ان کے متعلق ہمارے خیالات اور نقطۂ نظر میں ایک زبردست تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ انھیں علماء کی بدولت ہم اس قابل ہوئے ہیں کہ مختلف روایات میں تفریق کر سکیں خصوصاً ان روایات میں جو عراق میں پیدا ہوئیں، اور جن کے راوی سیف بن عمر ہیں۔ سب سے زیادہ مستند روایات مدینہ اور شام کی ہیں۔ ان کے علاوہ مصری روایات بھی ایک حد تک قابل اعتماد ہیں۔ لیکن ان سب روایات کی تصحیح بعد کے زمانے میں کی گئی، اور انھیں حالات زمانہ کے مطابق بنایا گیا۔ پھر عباسیوں کے عہد میں انھیں دوبارہ ترتیب دیا گیا۔ اور کوشش کی گئی کہ جہاں تک ہو سکے بنی امیہ کے عہد کو تاریک ترین ثابت کیا جائے۔ اب یہ سب روایات صرف عراقی نقطۂ نظر سے دلچسپ رہ گئی ہیں۔ ان سب کو ہمارے زمانے میں شہزادہ لیونے کے تانی کی عظیم الشان تاریخ میں جانچا اور جمع بھی کیا گیا ہے۔ اسی مصنف کے خیالات سے ہم نے استفادہ کیا ہے۔

یمامہ اور حیرہ کے درمیان بنجر زمین کا ایک تنگ حصہ ہے، جو آگے چل کر متمدن ممالک سے مل جاتا ہے۔ اس حصے میں زیریں فرات کی دلدلیں واقع ہیں، اور اسی سرزمین میں شمالی عرب (یعنی حضرت اسماعیلؑ کی اولاد) کا ایک قبیلہ بکر بن وائل آباد تھا، جو چھوٹے چھوٹے قبائل پر منقسم تھا۔ ان کا تعلق ان بے چین سرحدی قبائل سے تھا جن کی روک تھام کے لئے ایرانی حکومت نے حیرہ کی ریاست قائم کی تھی۔ ان میں سے خاص طور پر بنی شیبان کے کارنامے سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ یہی قبیلہ تھا جس نے اسلام سے قبل ۶۰۴ء اور ۶۱۱ء کے درمیان ذوقار کے مقام پر ایرانیوں کی باقاعدہ فوج کو شکست دی تھی۔ ایرانیوں پر عربوں کی یہ سب سے پہلی فتح تھی۔ یہی بنو شیبان اور ان کے شیخ مثنیٰ بن حارث تھے جنھوں نے خالد بن ولید اور ان کی اسلامی فوج کو اس پر آمادہ کیا تھا کہ وہ پہلی مرتبہ ایرانی سرحد عبور کریں۔ اس کے بعد دوسرے

قبائل نے بھی بنوشیبان کی پیروی کی۔ یہ پہلا واقعہ تھا کہ عربوں نے اس طرح باقاعدہ فوجی حیثیت سے ایرانی سرحد کو عبور کیا۔ یہ واقعہ محض اتفاقی نہیں تھا، بلکہ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بھی شرقیین کی توسیع کی محض ایک کڑی تھی، جو اسلام کو قبل اسلام کے اس قسم کے واقعات سے ملا دیتی ہے۔ بنوشیبان عام بکر بن وائل کی طرح مدینہ سے وابستہ نہ تھے، اور نہ یہ ثابت ہے کہ انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ لیکن اب جب کہ مدینہ کی حکومت اچانک یمامہ تک وسیع ہو گئی تھی، اور تمام عرب حضرت خالد بن ولید کی فاتحانہ حکایات سے گونج رہا تھا، بکر بن وائل بھی جوق در جوق عربوں کی نئی حوصلہ مند حکومت کے ساتھ مل کر اپنے آبائی دشمن ایرانیوں کے خلاف تیار ہو گئے۔ اس کے بعد جو کچھ پیش آیا وہ یہ تھا کہ ان کے عزیز و اقارب مسلمان محض ضروریات زندگی کے حصول کی خاطر اپنے ہی عزیز و اقارب کے زیر حفاظت آگے بڑھے، اور انھیں کی مدد سے اس متمدن ملک، یعنی ایران، میں غارت گرانہ یورشیں شروع کیں۔ خالد بن ولید اس قسم کے واقعات اور حادثات کی تلاش میں رہتے تھے۔ انھیں اپنی فوجی استعداد اور قائدانہ صلاحیت دکھانے کا موقع ہاتھ آیا، اور انھوں نے فوراً فائدہ اٹھایا۔ روایات کے مطابق بکر بن وائل کے قبائل کے سردار، جن میں مثنیٰ بن حارث پیش پیش تھے، مدینہ میں حضرت ابو بکرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اسلام قبول کیا، اور ان سے اجازت لی کہ وہ خالد بن ولید کے ساتھ مل کر عراق پر حملہ کریں۔ لیکن حقیقت میں یہ روایت کچھ زیادہ قابل اعتبار نہیں معلوم ہوتی کہ خود خلیفہ بہیئت مجموعی یہ چاہتے تھے کہ خالد بن ولید بکر بن وائل کے قبائل سے متحد ہو جائیں۔ بہر حال یہ امر کچھ زیادہ خلاف قیاس نہیں کہ حضرت ابو بکر نے خالد بن ولید کو ایک عام اجازت دے دی تھی کہ وہ بکر بن وائل کے ساتھ اس مہم میں شریک ہو جائیں، کیونکہ ایسی روایات موجود ہیں کہ قبیلے کے رئیس نے اسلام قبول کر لیا تھا، گو باقی قبیلے کے متعلق اس قسم کی

یقینی خبر ہم تک نہیں پہنچی۔ اتنا یقین ہے کہ اس واقعے کے بعد بکر بن وائل مدینہ سے وابستہ ہو گئے تھے، اور اسلام کے سیاسی دائرے میں داخل ہو گئے۔ بعد میں جو تبدیلیاں بسرعت واقع ہوئیں انھوں نے اس قبیلے کو خلافت سے اور بھی زیادہ وابستہ کر دیا۔ ابتدا میں حضرت ابوبکرؓ کا ہرگز یہ خیال نہ تھا کہ وہ باقاعدہ طور پر عراق پر قبضہ کریں۔ بلکہ اس کے برعکس حکومت مدینہ کی نظر متواتر شام پر پڑ رہی تھی، کیوں کہ شام ہی مدینے سے نزدیک تر واقع تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ خالد بن ولید کو شام بھیجیں۔ لیکن وہ، خواہ خلیفہ کی اجازت سے یا ان کے علم کے بغیر، بنو شیبان کے کوچ میں شریک ہو چکے تھے۔ خلافت کا خیال عراق کی فتح سے کس قدر دور تھا، اِس کا پتہ اس واقعے سے چلتا ہے کہ حضرت خالد بن ولید کی فوج کا بڑا حصہ آرام لینے کی خاطر اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو چکا تھا، اور وہ تقریباً صرف پانچ سو چیدہ سپاہیوں کے ساتھ ایرانی علاقے میں داخل ہوئے تھے، اور پھر اس کے بعد اس فوج کو لے کر شام چلے گئے تھے۔

حضرت خالد بن ولید بہ ہیئت مجموعی اپنی ہی مرضی سے وسط عرب سے فرات کی دلدلوں کے مغرب کی طرف روانہ ہوئے، اور خَفَّان کے مقام پر بنو بکر سے، جو مثنیٰ کی زیر سرکردگی تھے، مل گئے۔ مثنیٰ کی فوج کی تعداد دو ہزار اور تین ہزار کے درمیان تھی۔ لیکن خوش قسمتی قدم قدم پر ان کا ساتھ دے رہی تھی، بلا کسی مزاحمت کے اس فوج نے حیرہ کے شمال کی زرخیز اور شاداب سرزمین کو لوٹا، اُلّیس کو جلا کر خاکستر کر دیا، اور اچانک حیرہ کے سامنے ظاہر ہوئی۔ شہر کی قلعبندی بہت استحکام سے کی گئی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مقیم فوج کھلے میدان میں لڑنے کی ہمت نہ کر سکی۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ دیواروں کے پیچھے کسی قسم کی مزاحمت کس مصرف کی تھی، جب کھلے میدان میں تمام زرخیز زمینیں تباہ و برباد ہو رہی تھیں؛ اس لئے

بہت جلد اہل شہر نے ایک معاہدہ طے کیا، اور زر فدیہ دے کر اپنی جان بچائی۔ یہ زر فدیہ ساٹھ ہزار درہم تھا۔ ہمیں یہ رقم مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے، لیکن اس زمانے کے عربوں کو یہ بھی بے انتہا معلوم ہوتی ہوگی۔ اس طرح فتح و ظفر کے ساتھ حضرت خالد بن ولید واپس ہوئے۔ لیکن حیرہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوگیا۔ یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ جو رقم ادا کی گئی تھی وہ سالانہ خراج کی صورت رکھتی تھی۔ اس مبارک مہم کے بعد خالد بن ولید خلیفہ کی اجازت سے اپنی وفادار فوج کو لے کر دشمن کے ملک میں سے گزرے۔ ان کا حال بجلی کا سا تھا کہ کبھی یہاں کوندی اور کبھی وہاں۔ اس طرح حیرہ سے براہ تدمُر شام کی طرف روانہ ہوکر وہ اچانک دمشق کی دیواروں کے نیچے ظاہر ہوئے۔ یہ قابل یادگار کوچ، جو فوجی لحاظ سے بے مثل تھا، اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ ایران کی فتح کسی صورت میں خلیفہ کے پیش نظر نہیں تھی، بلکہ مسلمانوں کی پوری فوجی قوت شامی مہم پر خرچ ہو رہی تھی۔ حیرہ کے خلاف اسلامی مہم عین اس وقت پیش آئی جب کہ ایران لامرکزیت اور بدامنی کے چکر میں پھنسا ہوا تھا۔ یزدگرد کو تخت پر بیٹھے چند مہینے ہوئے تھے، اور تخت شاہی کے دوبارہ قیام و استحکام کے بعد تمام مرکزی اقتدار سپہ سالار رستم کے ہاتھ میں تھا۔ حکومت کا اقتدار مشکل سے قائم ہوا ہی تھا کہ اُسے ان عرب فوجوں کے خلاف جنگ کی تیاری کرنی پڑی۔ مثنیٰ نے مدینہ سے مدد مانگی۔ یہ حضرت عمرؓ کے ابتدائی عہد خلافت کا ذکر ہے۔ وہ لوگوں کی مرضی کے خلاف اپنی رائے پر عمل کر سکتے تھے، لیکن اپنی چیدہ فوج کو شام سے بلانا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ چند کارروائیوں کی وجہ سے، جو فوجی لحاظ سے قابل اعتراض تھیں، بکر اور اہل مدینہ کی متحدہ فوج دو کوچوں میں بالکل تباہ ہوگئی تھی۔ جنگ جسر میں مثنیٰ نے بڑی کوشش سے مسلمانوں کی بقیۃ السیف فوج کو بچایا (۲۶ نومبر ۶۳۴ء) یہ شکست حضرت عمرؓ کے عہد خلافت

کے پہلے سال میں واقع ہوئی، اور اس نے حضرت عمرؓ کی جد و جہد میں سرعت پیدا کر دی۔ اسی کے ساتھ عراق کے حالات اور واقعات بھی تبدیل ہو گئے۔ اس کا ذکر ہم آئندہ کریں گے۔ لیکن بہر حال عہد وسطیٰ کی تاریخ کے لئے قدرتی طور پر بحیرۂ روم کے علاقوں میں عربوں کی توسیع سلطنت تاریخ عالم کے لحاظ سے بلا شبہ زیادہ وسیع اور اہم ہے۔

ان واقعات کے متعلق تمام عربی اسناد ایک خاص نقطۂ نظر سے لکھے گئے ہیں، اور اس کے علاوہ خصوصاً سنین و تاریخ کے معاملے میں بہت ہی قابل اعتراض ہیں۔ خوش قسمتی سے چند بازنطینی اسناد ان واقعات کے متعلق دستیاب ہوئے ہیں جن سے ہم تفصیلات معلوم کر سکتے ہیں۔ ان میں تھیوفینس خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ان اسناد سے پتہ چلتا ہے کہ گو خلفاء تمام دنیا کو فتح کرنا چاہتے تھے، لیکن ان مہمات کا آغاز خود ان کی فہم و فراست سے نہیں ہوا تھا بلکہ اس کے برعکس سرحدی علاقوں کے مسیحی عرب قبائل نے مدینہ کی حکومت سے مدد کی استدعا کی تھی۔ بظاہر ہمیں اس کا علم نہیں کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تعلقات شمالی عرب کے طاقتور قبائل، مثلاً جُذام، کلب، قضاعہ، لخم اور غسان سے کیسے تھے۔ موتہ کے واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قبائل مدینہ کے حریف اور دشمن تھے۔ سب سے پہلے تبوک کے خلاف مسلمانوں کی مہم کی وجہ سے، جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے دو برس قبل واقع ہوئی، مسلمانوں کے کچھ دوستانہ تعلقات فلسطین کے جنوبی سرحد کے چند قبائل سے پیدا ہوئے تھے۔ مگر بڑے بڑے قبیلے، جیسے غسان، اب تک بازنطینیوں کی طرف سے ان کی فاتحانہ جنگوں میں لڑ رہے تھے۔ بحیرۂ مردار کے جنوب کے قبائل جیسے جُذام اور قضاعہ، جو مدینہ سے غیض کو جانے والے راستے پر حاوی تھے، ان کے لئے بہت سے اسباب و وجوہ پیدا

ہو گئے تھے کہ وہ اہل مدینہ سے قریب تر ہو جائیں، اور ان کی طرف مائل ہوں۔ اب تک وہ بازنطینیوں کے تنخواہ دار تھے، اور ظاہرہ طور پر عیسائی بھی تھے۔ اس لئے اس کا گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ قبائل کسی وقت مسلمانوں کے ساتھ متحد ہو جائیں گے۔ لیکن ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ جنگ موتہ کے بعد ہی قیصر ہرقل نے فیصلہ کیا تھا کہ جو سالانہ رقم جنوبی سرحد کے ان خانہ بدوش قبائل کو دی جاتی تھی اُسے روک دیا جائے۔ وجہ یہ تھی کہ ایرانی جنگ کے موقع پر اُسے مجبوراً کلیسا سے بہت بڑی رقم قرض لینی پڑی تھی، اور اُسے ادا کرنے کے لئے ضروری تھا کہ اخراجات میں انتہائی کفایت سے کام لیا جائے۔ ایرانیوں کے خلاف میدان جنگ میں فتح و ظفر حاصل کرنے کے بعد ہرقل سمجھتا تھا کہ کوئی خطرہ باقی نہیں رہا، اور اس طریقے سے رقم بچا کر قرض بے باق کر سکتا تھا۔ اس کا خیال بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ عرب، جو اب تک اس قدر منتشر اور پراگندہ تھے، اور اپنے وطن کے ریگستانوں میں پڑے ہوئے تھے، وہ کسی وقت متحد ہو کر مقابلے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ شمالی عرب کے باشندوں میں اتحاد مکمل ہو گیا تو اس کے بعد عام اتحاد کا امکان بھی بڑھ گیا۔ تھیوفنیس کے بیان کے مطابق اس سالانہ رقم کے بند ہونے اور مسلمانوں کی یورش میں ایک گہرا تعلق تھا۔ اس واقعے کے ساتھ ساتھ اسی زمانے میں وسط عرب میں حضرت خالد بن ولید کی فتوحات کی خبریں انھیں پہنچیں، اور یہ سرحدی قبائل مشرق کے بکر بن وائل کی طرح سوچ میں پڑ گئے۔ مگر جب بازنطینی حکومت نے ان کی سالانہ رقم بھی روک دی تو وہ قدرتی طور پر مسلمانوں کی طرف مائل ہو گئے، اور ان سے متحد ہو کر انھوں نے اُس رقم کو، جو بطور ضمانت امن انھیں دی جاتی تھی، بذریعۂ قتل و غارت حاصل کرنا چاہا۔

ان قبائل کے فیصلے کی توثیق خلیفہ نے کر دی؛ کیونکہ انھیں بخوبی معلوم تھا کہ

آنے والے طوفان میں ان قبائل کو وہ اپنی بہتری اور توسیع کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ عربی اسناد کے مطابق، بظاہر شروع میں اہل مدینہ ان پر خطر مہموں کی طرف زیادہ مائل نہیں معلوم ہوتے، کیوں کہ ان کے دلوں میں ابھی تک واقعۂ موتہ کی یاد تازہ تھی۔ بہر حال ۱۳ھ کے موسم خزاں میں فوج کے چھوٹے چھوٹے حصے شام کی طرف بھیجے گئے۔ پہلا حصہ یزید بن ابوسفیان کے ماتحت تھا، جو آئندہ ہونے والے خلیفہ، حضرت معاویہ کے بھائی تھے۔ دوسرا حصہ شُرَحبیل بن حسنہ اور تیسرا عمرو بن عاص کے ماتحت تھا۔ مذکورہ بالا پہلے دو حصوں میں تعاون سب سے زیادہ تھا۔ انھوں نے سیدھا بتوک معان کا راستہ اختیار کیا۔ عمرو بن عاص ساحل بحر کے ساتھ عقبہ روانہ ہوئے۔ اس کے بعد فوج کے اور چھوٹے چھوٹے حصے آئے، جنھوں نے جنوب میں شرق اردن کا رخ کیا۔ پہلے سپہ سالار جنھیں جنگ پیش آئی یزید بن ابوسفیان تھے۔ مشرق کی طرف سے چل کر وہ وادیٔ عَرَبَہ میں اترے، جو بحیرۂ مردار کے جنوب میں کھلا ہوا میدان ہے۔ یہاں اُن کا سامنا اچانک تقریباً ایک ہزار بازنطینیوں سے ہوا جو سرجیس[1] نام قیساریہ کے ایک بطریق کے ماتحت تھے۔ یہ ایک ہزار فوج منتشر کر دی گئی، اور غیض کی طرف پسپا ہوئی۔ لیکن غیض پہنچنے سے قبل ۴ فروری ۶۳۴ء کو عربوں نے اس کی مزاحمت کی، اور وہ بالکل فنا ہو گئی۔ خود سرجیس بھی اس جنگ میں کام آیا۔ اس مبارک فتح کے بعد یزید بن ابوسفیان نے بحیرۂ مردار کی طرف واپس ہوئے۔ اس کے بہت جلد بعد عمرو بن عاص ایلہ میں تازہ دم فوج کے ساتھ ظاہر ہوئے، جس میں نئے سپاہی جوق در جوق شریک ہو رہے تھے۔ ان لوگوں نے جنوبی فلسطین کو غیض تک خوب لوٹا، اور عمرو بن عاص قیساریہ کی سرحد تک پہنچے۔

---

[1] SERGIUS

ان واقعات کی خبر پاکر آخر کار قیصر ہرقل نے شمالی شام، یعنی حمص کے علاقے کی ایک زبردست فوج دمشق کے جنوب میں جمع کی، اور اپنے بھائی تھیوڈورس کو اس کا سپہ سالار مقرر کیا۔ یونانیوں کے لئے یہ قطعی ناممکن تھا کہ وہ عربوں کے جنگی ارادوں سے واقف ہوں۔ یہ لوگ حقیقت یہ ہے کہ بغیر کسی ارادے کے چلے تھے۔ ہر افسر جدھر چاہتا تھا رُخ کرتا تھا، اور جہاں مال غنیمت ملنے کی اُسے زیادہ امید ہوتی تھی چلا جاتا تھا۔ اغلب یہ ہے کہ تھیوڈورس کی فوج نے شرق اردن میں عربوں کی فوج کے ایک حصے کو تباہ کیا۔ لیکن بہر حال عرب بہت جلد جنوب کی طرف بڑھے، جہاں سب سے زیادہ خطرہ معلوم ہوتا تھا۔ بیت المقدس سے گزر کر، ساحل بحر کو قطع کر کے انھوں نے قیساریہ اور غیض کو دھمکیاں دینی شروع کیں۔ عین اسی وقت حضرت خالد بن ولید نے دریائے فرات کا شہرہ آفاق کوچ کیا، اور دمشق کے سامنے پہنچے۔ یہ ۲۴ اپریل ۶۳۴ء کا واقعہ ہے۔ یہاں ان کی مزاحمت نہیں کی گئی، کیونکہ تمام فوجیں جنوب کی طرف روانہ ہو چکی تھیں۔ فوجی نقطۂ نظر سے، جس کے وہ سب سے بڑے مبصر تھے، خالد بن ولید نے جن کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ وہ مال غنیمت کے دلدادہ نہیں تھے، دیکھا کہ جنوبی فلسطین میں مسلمانوں کی حالت نہایت ہی نازک ہے۔ اب وہ بڑی مشکلات میں شرق اردن سے جنوب کی طرف بڑھے، اور ان فوجوں سے جا ملے، جو ذاتی مفاد کے لئے اس سمت میں جارہی تھیں۔ آخر کار وہ وادئ عربہ میں عمرو اور یزید کی فوج کے ساتھ مل گئے، جو بازنطینیوں کی بڑھتی ہوئی فوج کے سامنے پس پا ہو رہے تھے۔ اب مسلمانوں کی فوج پھر تھیوڈورس کے مقابل ہوئی۔ یونانی فوج نے بیت المقدس اور غیض کے درمیان اجنادین، یا بہتر نام جنّا بتّین، میں ایک مستحکم چھاؤنی قائم کی تھی۔ ۳۰ جولائی ۶۳۴ء کو ایک خون ریز جنگ ہوئی، جس میں عربوں کو کامل فتح ہوئی۔ یہ سوال حل کرنا مشکل ہے کہ اس موقع پر مسلمانوں کا سپہ سالار کون تھا، یا ان کا کوئی سپہ سالار

تھا بھی یا نہیں لیکن بہت زیادہ غلطی نہ ہو گی اگر ہم اس جنگ کا اصل فاتح خالد بن ولید ہی کو سمجھ لیں۔ اب فلسطین کا تمام میدانی علاقہ مسلمانوں کے سامنے تھا۔ قلعبند شہروں کی کیفیت یہ تھی کہ ان میں فوج موجود نہیں تھی۔ اس لئے یہاں مسلمانوں کی کوئی قابل ذکر مزاحمت نہیں ہوئی۔ عربوں کی نظر زیادہ تر خراج کی رقم پر رہتی تھی۔ انھوں نے اپنی ان انتہائی کامیابیوں کے بعد بھی باشندوں کے ساتھ ایسا ہی نیک سلوک کیا، جیسا کہ وہ بعد میں کیا کرتے تھے۔ بیان کیا گیا ہے کہ حیرہ کی فتح کے بعد جو طرز عمل انھوں نے اختیار کیا تھا وہی غبض کی فتح کے بعد کیا، اور صرف خراج عاید کرنے پر اکتفا کیا۔ بیت المقدس کے بطریرک سوفرونیوس نے سنہ ۶۳۴ء کے اپنے ایک وعظ میں ملک کی ابتری کا نہایت دردناک نقشہ کھینچا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تمام ملک میں بدامنی کا دور دورہ تھا، عرب ہر طرف پھیل گئے تھے، اور شمال تک پہونچ گئے تھے۔ کیوں کہ سنہ ۶۳۶ء کی جنوری میں معلوم ہوتا ہے کہ عرب حمص کے سامنے ظاہر ہوے تھے۔ یہ ایک شامی مورخ کا بیان ہے اور اس میں شک کی گنجائش نہیں۔

جنگ اجنادین کے چھ مہینے بعد رفتہ رفتہ فاتحین کے نقطۂ نظر میں تبدیلی واقع ہوئی جو قابل غور ہے۔ خالد بن ولید اور عمرو بن عاص کے سپاہیوں نے محسوس کیا کہ محض غیر منظم خراج پر زندگی بسر کرنا ناممکن ہے، اور ملک کو باقاعدہ طور سے فتح کر کے اس کے نظم ونسق کی تنظیم ضروری ہے۔ اس کے علاوہ جنگ اجنادین کے بہت جلد بعد سنہ ۶۳۴ء میں حضرت ابوبکر کا انتقال ہو گیا۔ انھوں نے وفات سے قبل بلند حوصلہ حضرت عمر کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا، اور لوگوں نے بلا اعتراض اس انتخاب کو تسلیم کر لیا تھا۔ محاذ جنگ پر بھی یہ واقعہ ایسا ہی اثر پذیر ہوا جیسا کہ مرکزی حکومت میں ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے جزیرہ نماء عرب کے جنوبی باشندوں کی نقل وحرکت میں سرعت پیدا ہوئی۔ انھوں نے بھی حروب ردہ کے خاتمے پر اہل مدینہ کی قابل تقلید مثال پر عمل کر کے

شام کا رخ کیا۔ لیکن یہ نئے آنے والے منتظم فوج کی صورت میں نہیں آئے، بلکہ انھوں نے بیوی بچوں سمیت نقل مکان کیا، اور یہ ارادہ کیا کہ شام کی زرخیز زمین میں اپنا مستقل وطن بنالیں۔ یہ عمل جواب شروع ہوا، اور چند سال تک برابر جاری رہا، اُسے نظر انداز کرنا ناممکن ہے۔ جنگ یرموک کے بعد سب سے پہلے عربوں نے ملک کو باقاعدہ منظم کرنے کی کوشش شروع کی۔ لیکن جنگ اجنادین کے چھ مہینے بعد عربوں کی زبردست آمد شروع ہوگئی تھی۔ قیصر ہرقل کی آخری فوجیں دمشق کی طرف پس پا ہوئیں شکست خوردہ تھیوڈورس کو قسطنطنیہ واپس بلالیا گیا تھا، اور اب بینز سپہ سالار تھا۔ اس نے ۶۳۵ء کے آغاز میں اپنی فوجیں فحل میں جمع کیں۔ فوجی نقطۂ نگاہ سے یہ ایک اہم مقام تھا اور بحیرۂ جنیزرتھ کے جنوب میں اردن کے راستے پر واقع تھا، دمشق کے راستے میں پڑتا تھا اور اس کی حفاظت کرتا تھا۔ بینز نے چاہا کہ پانی کے بند توڑ کر عربوں کی رفتار روک دے۔ لیکن انھوں نے فوراً تبدیل شدہ حالات کا اندازہ کرلیا، اور حضرت خالد بن ولید کی سرکردگی میں ۲۳ر جنوری ۶۳۵ء کو فحل میں یونانیوں کی زبردست مقاومت کا خاتمہ کر دیا، اور بَیسا بھی اچانک فتح کرلیا۔ اس کے بعد انھوں نے فوراً دمشق کے خلاف روانہ ہونے کا ارادہ کیا۔ مگر ایک مرتبہ پھر ۵ر فروری ۶۳۵ء کو بنیز نے انھیں مرج الصفر پر روکنے کی کوشش کی اور پھر شکست کھائی۔ دو ہفتہ بعد مسلمان دمشق کے سامنے موجود تھے۔

صحیح معنوں میں جسے محاصرہ کہتے ہیں اس فن سے عرب بالکل ناواقف تھے۔ اس لئے انھوں نے چاہا کہ دمشق کو گھیر کر آمد و رفت مسدود کردیں، اور وہاں کے باشندوں کو مجبور کریں کہ وہ خود ہی مقیم فوج کو ہتھیار ڈال دینے پر آمادہ کردیں۔ چنانچہ موسم خزاں کے شروع میں شہر نے آخر اطاعت قبول کرلی۔ (اگست۔ ستمبر)۔ ہرقل کی تمام کوششیں ناکام رہیں، اور مسلمانوں نے یونانیوں کو سخت

نقصان پہنچا دیا تھا۔ اطاعت پذیری کا واقعہ دمشق کی شہری آبادی کی غداری سے پیش آیا، اور اس غداری میں وہاں کے اسقف اور محاصل جمع کرنے والوں نے بہت مدد دی۔ فتح دمشق کے بعد بازنطینی فوج کا خیال دل میں لائے بغیر مفتوحہ علاقوں کی تنظیم اور انھیں پر امن بنانے کا کام شروع کر دیا۔ کیونکہ اب ان کا خیال تھا کہ یونانیوں سے انھیں کوئی خطرہ نہیں رہا۔ مختلف سپہ سالار فلسطین اور شرق اردن میں اپنی فوجی کارروائیاں کررہے تھے۔ خالد بن ولید نے سرے سے حمص کی طرف روانہ ہوئے، اور ۶۳۵ء کے آخر میں اپنی فوج وہاں ٹھیرا دی۔ متعدد چھوٹے چھوٹے شہروں نے اپنے دروازے مسلمانوں کے لیے کھول دئے، اور بڑے شہر اور قلعے، جیسے بیت المقدس، قیساریہ اور بندرگاہ ابھی اس انتظار میں رہے کہ ہرقل سے انھیں امداد ملے گی۔

یقیناً قیصر ہرقل کا اب تک یہ ارادہ نہیں تھا کہ بے بس ہو کر شام عربوں کے حوالے کردے۔ اس نے نہایت سرعت اور تندہی سے انطاکیہ اور حمص میں اپنی تمام فوجی قوت جمع کی۔ معمولی باقاعدہ بازنطینی فوج کے علاوہ ارمنی اور عرب اس نئی فوج کے چیدہ سپاہی تھے۔ یہ فوج تھیوڈورس تری تھیوریوس کے ماتحتی میں دی گئی۔ اس کے علاوہ بنیز بھی ایک الگ مستقل فوج کا سپہ سالار تھا، جو اسی بڑی فوج میں شامل تھی۔ اب چونکہ دمشق پر دوبارہ قبضہ کرنا ناممکن تھا، اس لئے ہرقل نے موسم سرما کا زمانہ عربوں کے خلاف تیاری کی سعی وکوشش میں گذارا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک ہی زبردست حملے میں عربوں کا خاتمہ کردے۔ یہ نئی فوج ۶۳۶ء کے آغاز میں اچانک حمص کی طرف بڑھی، جہاں حضرت خالد بن ولید کا مقدمۃ الجیش مقیم تھا۔ اس جلیل القدر سپہ سالار نے ایک نظر میں بھانپ لیا کہ یہ سب سے زیادہ نازک موقع ہے۔ اس وقت تک عربوں کا مقابلہ بازنطینیوں

کی چھوٹی چھوٹی فوجوں سے ہوا تھا۔ لیکن اب خالد بن ولید نے دیکھا کہ دشمن کی پچاس ہزار فوج ان کے مقابلے کے لئے آ رہی ہے، اور پہلی فوجوں کے مقابلے میں بہت ہی مستعد اور منظم ہے۔ انھوں نے فوراً حمص سے قبضہ اٹھا لیا، اور دمشق کو بھی چھوڑ دیا۔ انھوں نے عربوں کی تمام فوجی قوت کو ایسی جگہ جمع کیا جو فوجی لحاظ سے بہت اہم تھی۔ یہ مقام شمالی اور جنوبی اسلامی چھاؤنیوں کے درمیان شرق اردن میں عمیق وادی یرموک کے جنوب کی جانب واقع تھا، اور اُس مقام کے شمال میں تھا جسے آج کل دَیرعات کہتے ہیں۔ یہاں عرب اس وقت شام کے زرخیز علاقے میں تھے، جہاں سے شرق اردن کے جنوب اور وسط فلسطین کے اہم ترین راستے جاتے تھے، اور ان کے دونوں بازو اس طرح محفوظ تھے کہ یرموک کا معاون دریا اس عمیق وادی میں سے گذرتا تھا۔ اگر انھیں اس جنگ میں شکست ہو تو جا ءِ وقوع ایسی تھی کہ ان کے لئے صحراءِ عرب اور مدینہ کی طرف پس پا ہونے کا راستہ کھلا ہوا تھا۔ عربوں کا اس جگہ سرعت سے پہنچ جانا ظاہر کرتا ہے کہ وہ اس موقعے کو کس قدر نازک سمجھتے تھے۔ ان کی تعداد دشمن کی بڑھتی فوج کے مقابلے میں نصف تھی۔ وہ تقریباً صرف پچیس ہزار فوج میدان میں لا سکے تھے۔

یونانی دمشق ہوتے ہوئے میدان جنگ میں نہیں آئے، بلکہ اردن میں سے گزر کر جِلّان، یا جیسا کہ قدیم کتابوں میں ہے، جِلّیق کے پاس سے ہو کر وہاں پہنچے۔ دونوں فوجیں کافی مدت تک ایک دوسرے کے سامنے پڑی رہیں۔ عرب کو کمک کا انتظار تھا، اور بازنطینی فوج اپنے افسروں کی ناچاقیوں، اور اپنے سپاہیوں کی سرکشی اور حکم عدولی کا تماشا دیکھ رہی تھی۔ یہی چیزیں اُسے جنگ سے روک رہی تھیں۔ بہر حال متعدد جھڑپیں ہوئیں۔ سب سے پہلے تھیوڈورس نے

شکست کھائی اور قتل ہوا۔ اس کے بعد فوج کے سپاہیوں نے بینز کے قیصر ہونے کا اعلان کر دیا۔ بازنطینیوں کے عرب حلیف اور ان کے سپاہی انھیں چھوڑ کر چل دئے۔ ان حالات میں مسلمانوں کو بازنطینی فوج کا کوئی خوف نہ رہا' اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مشرق کی طرف سے بازنطینی فوج کو گھیر لیا گیا تھا۔ اس طرح اب مسلمانوں نے دمشق کے ساتھ یونانیوں کے رسل و رسائل کے سلسلے مسدود کر دئے' اور وادی الرُقّاد کے پل پر قبضہ کر کے ان کی پسپائی کا راستہ بھی روک دیا۔ انجام کار مسلمانوں نے یونانیوں کو یرموک اور وادی الرُقّاد کے ایک گوشے میں ڈھکیل دیا۔ اب جو یونانی جنگ میں قتل نہیں ہوئے وہ دریا میں گر کر بہ گئے' کیونکہ دریا یہاں بہت گہرا تھا' جو دریا برد ہونے سے بچے' اور بچ کر یقوتا (؟) پہنچ گئے انھیں وہاں عربوں نے تہ تیغ کر ڈالا' کیونکہ وادیُ الرُقّاد پر قابض ہونے کے بعد عرب بآسانی واپس ہو جاسکے تھے۔ یہ جنگیں تقریباً ایک مہینے تک جاری رہیں۔ آخری شکست ۲۰ اگست ۶۳۶ء کو ہوئی۔ اس خوفناک اور خوں ریز جنگ نے شام کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ آخری فوج جس کے جمع کرنے میں ہرقل نے اپنی تمام قوت اور دولت صرف کر دی تھی' مکمل طور پر تباہ ہوگئی' اور چونکہ اس فتح کے بعد ہی عرب دمشق چلے گئے تھے' اس لئے یونانی دوسری فوج بھی جمع نہیں کرسکتے تھے۔ اس طرح موسم خزاں سے دمشق دوبارہ فتح ہوا اور مستقل طور پر عرب اُس پر قابض ہوگئے۔

اس سے قبل ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ مدینہ کی مرکزی حکومت نے تقریباً ایک سال قبل یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس قسم کی ترک تازیوں اور یورشوں کے بجائے جن میں کچھ خراج وصول ہو جاتا ہے' اب ملک پر باقاعدہ طور پر قبضہ کرنا شروع کیا جائے اس فیصلے کا مطلب یہ تھا کہ قابض و فاتح فوج کا ایک سپہ سالار اعظم بنایا جائے'

جو بوقت واحد سپہ سالار بھی ہو اور خلیفہ کے ماتحت ملک کا شہری حاکم بھی ہو۔ اس عہدے کے لئے ظاہر ہے کہ سب سے پہلے حضرت خالد بن ولید پر نظر پڑ سکتی تھی، جنہوں نے اپنی عظیم الشان فتوحات کی بدولت مسلمانوں میں سب سے اعلیٰ درجہ حاصل کر لیا تھا۔ خیال ہوتا ہے کہ انھیں کا انتخاب ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن اس جلیل القدر سپہ سالار میں کمزوری یہ تھی کہ ان میں مدبرانہ خصائل مفقود تھے، اور وہ یہ نہیں کر سکتے تھے کہ صلح و آشتی کے ذریعہ ملک میں امن پیدا کر دیں۔ اس عہدے کے لئے خلافت کو ایسے آدمی کی ضرورت تھی جس پر خلیفہ کو پورا بھروسہ بھی ہو، اور وہ اس کام کا اہل بھی ہو۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوعبیدۃ الجراح کو منتخب کیا۔ یہ صاحب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قدیم ترین اور معزز ترین صحابیوں میں تھے، اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ آپؐ کی وفات کے بعد انھوں نے خلیفہ کے انتخاب میں بڑا نمایاں حصہ لیا تھا۔ اور اسلام کو فساد و انتشار سے بچایا تھا۔ ان کے تقرر کے حکم پر جس کے مطابق اُس وقت کے افسر کو برطرف ہو جانا چاہیئے تھا، اس وقت عمل کرنا بہت مشکل تھا۔ یہ حکم عین اس وقت پہونچا جب کہ شام میں جنگ یرموک کے لئے فریقین تیار تھے۔ لیکن ایسے نازک وقت، جب کہ خالد بن ولید تمام موقع محل سوچ چکے تھے، یہ بہت ہی خطرناک تھا کہ سپہ سالاری کی خدمت کا جائزہ حضرت ابوعبیدۃ الجراح کو دے دیا جائے۔ جنگ یرموک کے بعد حضرت ابوعبیدہ نے اپنے نئے فرائض انجام دینے شروع کئے، انھوں نے مختلف افسران فوج کو ملک کے الگ الگ حصوں میں بھیجا، اور خالد بن ولید کو ساتھ لے کر شمال کی طرف بڑھے۔ بعلبک، حمص، حلب، انطاکیہ اور شمالی شام کے رہنے والے عرب قبائل نے بآسانی اطاعت قبول کر لی۔ صرف قنسرین میں کچھ دقت پیش آئی۔ شمالی شام سے عیاض بن غنم کو بعد میں ایک دوسرے سمت بھیجا گیا اور انھوں نے کسی بڑی مزاحمت کے بغیر میسوپوٹامیا پر بھی قبضہ کر لیا۔ یہ ۳۹ھ یا ۶۴۰ء کا

واقعہ ہے۔ لیکن بہر حال شمال میں خلافت کے مقبوضات کی سرحد اس زمانے میں عمان تھی۔
۶۳۳ء اور ۶۳۴ء کے دوران میں شرجیل اور یزید بن ابوسفیان اندرون ملک کے باقی ماندہ حصوں اور ساحلی مقاموں کو مستقل طور پر فتح کر چکے تھے۔ لیکن حضرت عمرو بن عاص کی فتوحات اتنی نمایاں نہیں تھیں۔ انھوں نے بیت المقدس کا بے سود محاصرہ کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ قیساریہ کا مستحکم شہر بھی ابتداءً عربوں کی دست برد سے باہر رہا۔ یہ محض اتفاقیہ امر نہیں تھا کہ بیت المقدس اور قیساریہ نے حملہ آوروں کی اس قدر سخت مزاحمت کی۔ بلکہ انھیں شہروں کی مزاحمت سے ہماری سمجھ میں یہ بات آسکتی ہے کہ عربوں کو اس قدر بے مثل فتوحات اتنی سرعت سے کیوں حاصل ہوئیں۔ قیصر کی فوجی قوت عرب حملہ آوروں نے بالکل توڑ دی تھی۔ اس پاس اب نہ دولت رہ گئی تھی کہ جنگ کی تیاری کرے، اور نہ اُسے سپاہی میسر آتے تھے کہ فوج ترتیب دے لے۔ لیکن اس میں تعجب کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ شام میں بازنطینی حکومت ان تمام علاقوں سے جہاں سامی آبادی کا عنصر زیادہ تھا اس قدر جلد اٹھ گئی، یا یہ کہ اس آبادی نے حملہ آوروں کا اتنا کم مقابلہ کیا۔ کیونکہ یہ لوگ عربوں کو اپنا ناجی سمجھتے تھے، اور اب ہرقل کی طرف سے انھیں کوئی خوف بھی نہیں رہا تھا۔ ہرقل کو اپنا قرض اتارنے کے وسائل سوچنے تھے، اور اس غرض سے اس نے جائز و ناجائز ہر طرح کے ذرائع اختیار کئے۔ انھیں مالی دشواریوں میں مذہبی مناقشات بھی شامل ہو گئے۔ ہرقل کی کلیسائی حکمت عملی یہ تھی کہ اس نے مونوتھی لیٹک عقائد کو رواج دیا اور مونوفی سائٹ فرقے اور یہودیوں کے خلاف احتساب قائم کر دیا۔ اس مذہبی اختلاف کے ساتھ یہ ردعمل بھی کام کر رہا تھا کہ آبادی کا پورا سامی عنصر یونانیوں کی اجنبی حکومت کے خلاف ہوتا جارہا تھا۔ بے شمار عیسائی عرب قبائل اور ان کے عزیز و اقارب شامیوں نے عربوں کو اپنے ملک میں بخوشی جگہ دی۔ پھر عرب جو خراج عائد

کرتے تھے وہ بھاری نہیں تھا، اور اس کے علاوہ عربوں نے باشندوں کو پوری مذہبی آزادی دے دی تھی۔ یہی نہیں، بلکہ سیاسی ضروریات کے لحاظ سے اُنھوں نے اُن لوگوں کی اور بھی ہمت افزائی کی جو سرکاری عقائد کے مخالف تھے۔ اس طرح مطلق العنان حکومت کی تباہی کے بعد بغیر کسی تکلیف کے تمام ملک مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔ بیت المقدس اور قیساریہ کی مزاحمت سے ہماری مذکورہ قول کی تصدیق ہوتی ہے، کیونکہ یہ دو شہر سرکاری مذہب کے پیرو تھے، ان میں مقیم فوج کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ لیکن یہ دونوں بھی زیادہ عرصہ تک مزاحمت نہ کرسکے۔ ۶۳۸ء میں بیت المقدس نے اطاعت قبول کرلی، اور اکتوبر ۶۴۰ء میں قیساریہ بھی غداری کا شکار ہوا اور معاویہ بن ابوسفیان نے اس پر قبضہ کرلیا۔

(باقی)

جمال الدین افغانی

آخری دفعہ قسطنطنیہ میں

از

جناب قاضی عبدالغفار صاحب

جس وقت شیخ آل عثمان کے دارالخلافہ میں پہونچے تو دولت عثمانیہ زوال وانحطاط کے مدارج بہت تیزی کے ساتھ طے کر رہی تھی۔ یورپین تدبر کی قوت نے اس کو بالکل بے دست وپا کر دیا تھا۔ شیخ اس بیمار کے بستر پاس اس وقت آئے جب نزع کا عالم شروع ہو چکا تھا۔ مرض الموت کی یہ داستان ۱۸۲۱ء سے شروع ہوتی ہے۔ جب محمد علی پاشا خدیو مصر کی قوت روز بروز بڑھ رہی تھی اور یونان بھی ترکی کے خلاف پوری تیاریاں کر رہا تھا۔ چنانچہ سلطان کو مجبور ہو کر محمد علی سے امداد مانگنی پڑی اور اس امداد کے معاوضہ میں موریا شام اور دمشق کی گورنری دینے کا وعدہ کرنا پڑا بالآخر ۱۸۲۶ء میں محمد علی کے بیٹے ابراہیم پاشا نے یونانیوں کو شکست دیکر اس بغاوت کو ختم کر دیا اور ایتھنز پھر ایک دفعہ چند روز کے لئے ترکوں کے قبضہ میں آیا لیکن انگلستان روس اور ترکی یونانیوں کی حمایت پر آمادہ ہوئے اور سینٹ پیٹرس برگ میں یونانی مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ایک کانفرنس منعقد کرائی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی کو بادل ناخواستہ یونان کو

بحیرۂ روم کے علاقوں میں عربوں کی فتوحات

از

جناب پروفیسر محمد جمیل الرحمن صاحب پروفیسر تاریخ جامعہ عثمانیہ

بیت المقدس کی فتح سے قبل ہی حضرت عمر شام تشریف لائے تھے۔ انکی تشریف آوری درحقیقت مدینہ کی اس حکمت عملی کا نتیجہ تھی کہ اب صرف فتح اور خراج کو چھوڑ کر ملک پر مستقل قبضہ کرنا چاہیئے۔ اسوقت اسلامی فوج کی سب سے بڑی چھاؤنی یرموک کے میدان جنگ سے ذرا شمال میں جابیہ کے مقام پر تھی۔ یہاں خلیفہ نے اپنے تمام سپہ سالاروں کو جمع کیا، جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ ان سب کے سامنے حضرت ابوعبیدۃ الجراح کے تقرر کے اہم فرمان کو اب خاص خلیفہ کے ذاتی حکم سے استوار کرنا چاہتے تھے۔ اسکے علاوہ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ذاتی طور پر وہ اصول مقرر کردیں جن کے مطابق مفتوحہ اقوام کے ساتھ روابط وضوابط قائم کئے جائیں۔ یہ ایک نہایت اہم مسئلہ تھا، جسے عہد حاضر کی زبان میں "ملکی سیاست" کہا جاتا ہے اس قسم کے خرچ کا فیصلہ کرنا بھی مقصود تھا جو بڑی مقدار میں بوصول ہو رہی تھی نظم و نسق کے قواعد وضوابط بھی پہلی مرتبہ اس موقع پر منضبط کرنے تھے۔ یا یوں کہئے کہ مرکزی حکومت کی طرف سے انکی توثیق کرنی تھی۔ زمانہ مابعد کی روایات کے مطابق حضرت عمر کو حقیقی اسلامی حکومت کے اصولوں کا بانی بتایا جاتا ہے لیکن جیسا کہ ہم آئندہ بیان کریں گے یہ بات کچھ زیادہ صحیح نہیں۔ انہیں پہلے ہی سے قواعد وضوابط

موجود ملے تھے۔ تمام انتظامات کی تکمیل کے بعد حضرت عمر بیت المقدس تشریف لے گئے اور وہاں سے مدینہ واپس ہوئے۔ ان کے نمائندہ کے طور پر حضرت ابو عبیدہ شام میں رہے۔ لیکن وہ بھی زیادہ عرصے تک اپنے فرائض انجام نہ دے سکے۔ کیونکہ ۶۳۹ء میں فاتحین کے ہزاروں سپاہی ایک وبا میں جو طاعون عمواس کہلاتی ہے، فنا ہو گئے۔ انہیں میں حضرت عبیدہ بھی تھے۔ ان کے جانشین یزید بن ابو سفیان کا بھی یہی انجام ہوا۔ یزید کے جانشین کے طور پر حضرت عمر نے انہیں کے بھائی معاویہ بن ابو سفیان کو نامزد کیا اس طرح اب وہ شخص شام کے سب سے بڑے عہدے پر مقرر ہوا جو مستقبل میں خود خلیفہ ہونے والا، اور مرکز خلافت کو مدینہ سے دمشق میں منتقل کرنے والا تھا۔ یہ تبدیلی بہت بڑے بڑے واقعات کی حامل تھی اور اس کے لئے معاویہ نے بڑی بڑی کوششیں کی تھیں۔

بالکل شام کی طرح جوں جوں اسلامی فوجیں عراق میں بڑھتی اور ترقی کرتی گئیں یہ معلوم ہوتا گیا کہ مرکز خلافت سے شامی مہموں کی طرح ان کی بھی رہنمائی کی جانی چاہئے۔ افسوسناک جنگ جس کے بعد مدینہ سے ایک بڑی زبردست محفوظ فوج عراق کی طرف روانہ ہوئی لیکن یہ فوج حکومت کی طرف سے نہیں بھیجی گئی تھی بلکہ مختلف قبائل کی طرف سے جمع ہوئی تھی جیسا کہ ہم پہلے ہی ان مہموں کے متعلق دیکھ چکے ہیں۔ قبیلہ بکر کے شیخ، مثنیٰ ابن حارث کی دلیرانہ جد و جہد سے یہ مہمیں شروع ہوئی تھیں لیکن سب سے پہلے دمشق کی پہلی فتح کے بعد ایک نئی مہم کے لئے خلیفہ کی رضامندی حاصل کی گئی۔ مگر اس وقت لڑنے والوں کی کمی تھی۔ کسی کی یہ خواہش نہیں تھی کہ وہ عراق جائے۔ صرف اس وقت جب ذاتی فائدے اور مال غنیمت کا یقین دلایا گیا تو چند یمنی قبائل وہاں جانے پر رضامند ہوئے۔ اس دوران میں ایرانیوں نے جو جنگ جسر کے بعد ایک سال تک خوب تیاریاں کر چکے تھے، مہران کی سرکردگی میں دریائے فرات کو عبور کیا۔ لیکن اس کے باوجود مثنیٰ اپنے مدینہ کے مددگاروں کے ساتھ جب ان سے مقابل ہوئے تو اکتوبر۔ نومبر ۶۳۵ء میں بویب کے مقام پر ایرانیوں نے شکست کھائی۔ مسلمان اپنی معمولی سی کمزور فوج کے ساتھ اس فتح سے فائدہ اٹھانے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے اور دوسری طرف حضرت عمر کو اپنی تمام فوج کی، جو وہ جمع کر سکیں، شام میں اشد ضرورت تھی کیونکہ وہاں ہرقل کی عظیم الشان فوج یرموک کے لئے سر پر چلی

آرہی تھی۔ سب سے پہلے یرموک کی فیصلہ کن جنگ کے بعد حضرت عمر نے عراق کی طرف توجہ مبذول کی اور پہلی مرتبہ ایک فوجی حاکم بھیجا گیا۔ اس خدمت کے لئے حضرت عمر نے سعد بن ابو وقاص کو منتخب کیا لیکن اس وقت بھی ضرورت کے مطابق فوج جمع کرنا آسان نہیں تھا۔ ۶۳۶ء اور ۶۳۷ء کا موسم سرما اس کوشش میں صرف ہوا اور اس پر بھی سعد بن ابو وقاص ایک ہزار سے زاید آدمی جمع نہ کرسکے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ یورپ کے مصنف عرب جمعیتوں کے جس مذہبی جوش و خروش کا ذکر کرتے ہیں وہ کس قدر بعید از قیاس ہے کیونکہ اصل واقعات سے اس بات کا پتہ نہیں چلتا۔

اس دوران میں اول تو ایرانی بویب کے حادثے سے ہوشیار ہوگئے تھے اور دوسرے انہیں اس کی بھی خبریں مل چکی تھیں کہ شام میں بازنطینی حکومت فیصلہ کن طور پر پاش پاش ہوچکی ہے اس لئے اب انہوں نے فیصلہ کیا کہ عربوں کی سخت ترین مزاحمت کی جائے۔ ایران کے نائب السلطنت رستم نے بذات خود سپہ سالاری کا کام اپنے ذمہ لیا اور دریائے فرات کو عبور کیا۔ قادسیہ کے قریب مزروعہ زمینوں کی سرحد پر سعد اور رستم کی فوجیں بہت دنوں تک ایک دوسرے کے آمنے سامنے پڑی رہیں۔ دونوں فوجوں کی تعداد کے متعلق کوئی بات یقینی نہیں۔ عربوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ پانچ اور چھ ہزار کے درمیان تھی۔ جن میں عیسائی اور غیر مسلم بھی شامل تھے۔ ایرانیوں کی تعداد کم از کم اس معمولی فوج کو تباہ کرنے کے لئے کافی تھی۔ فن حرب کے لحاظ سے اچھے سپہ سالار کو فتح ہوئی۔ صرف ایک دن کی جنگ میں ایران کی عظیم الشان فوج کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے اور رستم بھی جنگ میں کام آیا۔

اب سواد کا سرسبز و شاداب علاقہ عربوں کے لئے کھلا ہوا تھا۔ جو حالات شام میں پیش آئے تھے وہی یہاں پیش آئے۔ آرامی کاشتکاروں نے عربوں کو نجات دہندہ سمجھ کر ہاتھوں ہاتھ لیا۔ کسی بڑی مزاحمت سے دوچار ہوئے بغیر شرقین دریائے دجلہ تک بڑھتے چلے گئے، جہاں طیسفون، یا جیسا کہ عربوں نے اس کا نام رکھا ہے مداین کا دولت مند شہر آباد تھا۔ دریائے دجلہ کے داہنے کنارے کو لوٹا گیا اور کشتیوں کا پل توڑ دیا گیا۔ اب چونکہ عربوں نے معبر ہی کو تباہ کرڈالا تھا، اس لئے یزدگرد کی باقی ماندہ مقیم فوج اور اس کا تمام دربار وہاں سے بھاگے۔ جنگ شروع ہونے کے بعد ہی وہ ایران کے دوسرے مستحکم قلعوں کی

تلاش میں تھے۔ شہر مدائن نے اپنے دروازے کھول دیئے اور فاتحین کو یہاں اتنا مال غنیمت وصول ہوا جس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ چند ہفتہ یہاں آرام لینے اور خوشیاں منانے کے بعد فاتحین جلولا کے سلسلۂ کوہ کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ بھی ایک فاتحانہ کوچ تھا۔ اس کے بعد تمام عراق ان کے قبضے میں آ گیا۔ یہاں بھی محض اتفاقی امر نہیں تھا کہ عربوں کی ترقی اُن قلعوں پر آ کر رک گئی جہاں شامی اور عرب آبادی کی سرحد ختم ہوتی تھی۔ صرف صوبہ خوزستان نے فاتحین کے راستے میں کچھ رکاوٹیں پیدا کیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جنوب کے دلدلی علاقوں میں کچھ خاص حالات تھے کیونکہ دارالخلافہ نے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جو سرحدی قبائل وہاں آباد تھے ان سے جنگ قادسیہ کے بعد جزیہ وصول کیا اور بصرہ کے نو آباد شہر کو ایک مخصوص شکل دی۔ حکومت کا مرکز طیسفون کے بجائے اب خلیفہ کے حکم سے حیرہ کے قریب کوفہ قرار دیا گیا کوفہ بہت جلد خالص عربی چھاؤنی بن گیا۔ اور ایران کی قابل کاشت زمینوں میں عربیت کا سب سے زبردست اور مستحکم مرکز قرار پایا۔ کوفہ کے بعد بصرہ کو بھی ایک خاص اہمیت حاصل ہوگئی۔ ان دونوں شہروں کی مخاصمت نے آئندہ زمانہ میں عربوں کی سیاسی اور علمی زندگی پر اپنا گہرا اثر چھوڑا۔

ان زبردست فتوحات یعنے یرموک اور قادسیہ کے بعد عرب قبائل صحیح معنوں میں جوق در جوق نقل مکان کرنے لگے کیونکہ اب وہ قبائل بھی اپنے گھر چھوڑنے لگے جن کے تعلقات اس وقت تک بہت زیادہ دوستانہ نہیں تھے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ قابل زراعت زمینوں کو نعمت غیر مترقبہ سمجھتے تھے۔ یہاں ایک زبردست تبدیلی واقع ہوئی کیونکہ اب تک اسلام نے واقعات میں کوئی ایسا نمایاں حصہ نہیں لیا تھا جیسا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اور حضرت ابوبکر کے زمانے میں۔ اب یہ کوشش شروع ہوئی کہ عربوں کی ایک عالمگیر سلطنت قائم کی جائے، اور فتوحات کی باقاعدہ اور باضابطہ کوششوں کا آغاز ہوا جس میں اکثر و بیشتر تمام قبائل نے حصہ لیا۔ اس کی طرف پہلا قدم یوں اٹھایا گیا کہ شام اور میسوپوٹامیا کے صوبۂ عراق کو ملا کر ایک حکومت کے تحت کر دیا جائے۔ جو فوجی مہمیں شام میں شروع ہوئی تھیں وہ ۱۶۴۱ء میں موصل کی فتح پر جا کر ختم ہوئیں۔

اس قسم کی باقاعدہ فتوحات کا نقشہ خاص طور پر ایران کے لئے تیار کیا گیا۔ چونکہ عراق کے قبضے کا

مدتوں پہلے اندازہ نہیں کیا جا سکا تھا اس لئے وہاں سے آگے بڑھ کر وسیع تر فتوحات حاصل کرنے کا خیال لابدی طور پر پیدا ہوا۔ لیکن اس اثنا میں خود ایران میں ایک زبردست ردعمل شروع ہو چکا تھا، اور ایرانی قوم عربوں کی مزاحمت کے لئے تیار ہو گئی تھی۔ یہ مزاحمت بصرہ کی فوج کو خوزستان میں پیش آئی اور ۶۴۲ء میں تُستَر کی فتح پر ختم ہوئی۔ اس کا تمام دارومدار مفرور یزدگرد اور اس کے حاشیہ نشینوں یا ہمدردوں پر تھا جنہوں نے پورے ایران کو عربوں کے خلاف صف آرا کر دیا۔ خوزستان میں بصریوں اور کوفیوں نے باضابطہ طور پر تعاون کیا، اور اب یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ایران کی سرزمین پر ایک فیصلہ کن جنگ ہوگی چنانچہ ۶۴۲ء میں قدیم ہمدان کے قریب نہاوند کے مقام پر ایک جنگ لڑی گئی۔ عربوں کو زبردست فتح ہوئی، جس کے متعلق طرح طرح کے افسانے مشہور ہو گئے اس کے بعد کے واقعات عربوں کو محض بچوں کا کھیل معلوم ہوتے ہوں گے۔ لیکن اس فتح سے بھی عرب بڑے بڑے شہروں، مثلاً ہمدان، رے اور اصفہان کے مالک نہ بن سکے۔ یہ شہر برسوں بعد رفتہ رفتہ فتح ہوئے۔ سب سے بڑھ کر یہ ہوا کہ اس علاقے میں عربوں کے کوئی سامی ہم قوم موجود نہیں تھے کہ انہیں نجات دہندہ سمجھ کر ان کا خیرمقدم کریں۔ اس لئے اس علاقے کو فتح کرنے میں انہیں غیر معمولی دقت پیش آئی۔ واقعہ یہ ہے کہ اب یزدگرد کی طرف سے انہیں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ یہ بادشاہ جنگ نہاوند کے بعد ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگتا پھرا اور انجام کار اصطخر سے خراساں کے شہر مرو چلا گیا۔ وہاں اس کا نائب السلطنت موجود تھا۔ لیکن اس شخص نے دوراندیشی سے کام نہیں لیا، اور اپنے بدقسمت اور تباہ حال آقا کو بچانے کی کوشش نہیں کی بلکہ دشمنی سے پیش آیا آخر ۶۵۱ء میں یہ شہنشاہ جس کا تمام ساتھ دنیا چھوڑ چکی تھی، قتل ہوا۔

عرب اس وقت خراساں پہنچے جب ایران کا مرکزی صوبہ فارس فتح ہو چکا تھا۔ خلیج فارس کے راستے سے فارس پہنچنا بہت ہی آسان تھا۔ اس لئے قادسیہ کے فوراً بعد بحرین کی طرف سے اس علاقے پر حملے شروع ہو گئے تھے۔ طیسفون (کوفہ) اور بصرہ کے بعد یہ تیسرا مقام تھا جہاں عرب بڑی تعداد میں ایک بارگی ٹوٹ پڑے تھے۔ بعد میں ان مہموں کی قیادت ان فوجوں کے ہاتھ میں آئی جو بصرہ میں مقیم تھیں۔ اس کے علاوہ فارس ہی میں یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ وہاں نسبتاً زبردست مقاومت شروع ہوئی۔

عبداللہ بن عامر کی فتح اصطخر کے بعد اس مقاومت کا خاتمہ ہوا، اور سنہ مابعد میں عبداللہ بن عامر ہی نے اس کا بالکل قلع قمع کر دیا۔ اس میں خاص طور پر تمیم اور بکر نے اس کی مدد کی۔ اب خراساں طرف ایک زبردست ابتدائی یورش ہوئی۔ یہ خراساں کی پہلی فتح تھی مگر اسے کسی لحاظ سے آخری فتح نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ برسوں تک یہ جنگ وجدل جاری رہی، حالانکہ اس کے مقابلے میں شام وعراق تعجب خیز حد تک کم زمانے میں مسلمانوں کے قبضے میں پوری طرح آ گئے تھے۔ اس کے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایران میں عربیت نے کبھی جڑ نہیں پکڑی۔ اس کے برعکس دوسرے ممالک چند ہی صدیوں میں عربی بولنے والے ممالک میں شمار ہونے لگے! ایرانیوں نے اپنی قدیم مادری زبان اور روایات کو زندہ رکھا۔ وہ لوگ مسلمان تو ہوئے، لیکن اس مذہب کو بھی انہوں نے اپنا خاص رنگ دے دیا۔ چنانچہ آج کل بھی ایران شیعوں کا ملک ہے۔

شام وعراق کی عظیم الشان فتح کے دوران میں دارالخلافہ مدینہ اس نئی حکومت کا محور تھا۔ اور اسی کی حفاظت پر اس کی زندگی کا دار و مدار تھا۔ لیکن بازنطینی صوبہ مصر خطرناک طور پر مدینہ سے قریب تھا۔ یہاں سے نہ صرف شام کی دوبارہ مسیحی فتح شروع کی جا سکتی تھی۔ بلکہ خود مدینہ پر بھی ایک ضرب کاری لگ سکتی تھی۔ اس قسم کے حملے کسی لحاظ سے بعید از قیاس بھی نہیں تھے۔ اسکندریہ کے بعد سب سے بڑا فوجی بندرگاہ قلزم تھا۔ اس کے علاوہ مصر بازنطینی بیڑے کا سب سے بڑا صدر مقام تھا۔ وہیں اس حکومت کا جہاز سازی کا کارخانہ اور مرکز بھی تھا، اور بیڑے کا بڑا حصہ بھی یہیں رہتا تھا۔ ابتدائے عہد کے عرب ان خطرات کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ یہ کچھ بعید از قیاس نہیں ہے کہ مصر کی فتح ان مخصوص حالات کا نتیجہ ہو علاوہ بریں ایک بیڑے کی موجودگی ان نئی فتوحات، مثلاً شام کے ساحلی شہروں کو قابو میں رکھنے کے لئے ضروری تھی۔ قیساریہ پر قبضہ کرنے کی بے سود جد و جہد کے بعد یہ خطرہ اور بھی زیادہ نمایاں ہو گیا تھا۔ مصر کا غلہ بھی مرکزی اسلامی حکومت کے لئے کافی لالچ کا باعث ہو سکتا تھا، کیوں کہ اس سے عراق یا میسوپوٹامیا کے غلے کی کمی کو پورا کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ فتح مصر کے بعد ہی جب مدینہ میں قحط پڑا تو وہاں کی ضروریات کو مصر کے غلّے کی درآمد سے ہی پورا کیا گیا تھا۔ یہ یقیناً ایک غیر تاریخی خیال ہے جو عربوں کی تاریخوں میں ظاہر کیا جاتا ہے کہ مصر کی فتح خلیفہ کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب فوجی ضرورت نے

مسلمانوں کو مجبور کیا کہ وہ دیگر علاقوں کو فتح کرنے کی باقاعدہ کوشش کریں۔

مسلمانوں کو یقیناً اس کا بالکل علم نہیں تھا کہ مصر کے خلاف فوجی مہم بھیجنے میں اس وقت یہاں کے حالات کہاں تک ان کی مساعدت کریں گے۔ تقریباً دس برس کی ایرانی حکومت کے بعد جب ہرقل نے دوبارہ ملک کو فتح کیا تو وہاں ایک زبردست ردعمل شروع ہوا۔ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں ہرقل کو رقم کی ضرورت تھی۔ اُسے امید تھی کہ کلیسائی اعتقادات کے ذریعے مونوفی سائٹ اور ڈیوفی سائٹ فرقوں کے اختلاف کو ختم کر کے وہ متحدہ حکومت کو واحد کلیسا کے تحت لانے میں کامیاب ہو گا۔ لیکن اس سے قبل ہی مختلف فریق ایک دوسرے کے جانی دشمن ہو چکے تھے، اور کلیسائی مخالفت اس قدر سختی سے سیاسیات سے مل گئی تھی کہ سیاسیات اور مذہب کو جدا کرنا ناممکن تھا۔ اس لئے صلح کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔ مصر کا مونوفی سائٹ فرقہ مخالفت میں اس قدر آگے بڑھ گیا تھا کہ اتحاد کی کوششوں سے وہ بالکل الگ رہا بلکہ حکومت کی اس جدوجہد سے اسے نفرت ہو گئی۔ اس کے علاوہ ہرقل نے جسے صلح کرانے کے لئے بھیجا وہ بھی امن کا فرشتہ نہیں تھا کہ مذہبی اتحاد قائم کرتا، بلکہ وہ بدترین قسم کا عذاب دہندہ تھا۔ مصر کو دوبارہ فتح کرنے کے بعد ہی ۶۳۱ء کے موسم خزاں میں ہرقل نے کاکے سوس کے مقام فاسیس کے اسقف سرس کو بطریرک بنا کر اسکندریہ بھیجا، اور اسی کو شہری نظم و نسق کا افسر اعلیٰ بھی مقرر کیا۔ اس شخص نے دس سال تک مسلسل کوشش کی کہ قبطی کلیسا کو زبردستی مذہبی صلح پر مجبور کرے، قبطی مذہبی رسوم پر ہر طرح کی پابندیاں عاید کیں، اس کلیسا کے مذہبی پیشواؤں کو قتل کرایا اور اس کی تمام تنظیم خاک میں ملا دی۔ مرکزی حکومت نے اسے بھی کافی نہیں سمجھا اور اسی سرس کو مالیات کا انتظام بھی سپرد کر دیا، کہ وہی محاصل وصول کرے اور خرچ کرے۔ یہ اُس کے اہم فرائض میں داخل تھا اور مقصد بھی یہ تھا کہ وہ قیصر کا قرض اتارنے میں مدد دے۔ اس پر تعجب نہیں کرنا چاہئے کہ اس قابل نفرت اور مغضوب الغضب حاکم و بطریرک مصر کو بعد کے زمانے کی قبطی روایات میں دجال کہا جانے لگا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس پر شبہ ہے کہ اُسی نے مصر کو مسلمانوں کے حوالے کر دیا تھا۔ یقیناً یہی سرس ہے جسے اسلامی روایات میں مقوقس کہتے ہیں۔ مقوقس کون تھا؟ مصر کی اسلامی فتح میں یہ ایک اہم مسئلہ ہے۔ عرب اسے مصر کا بادشاہ سمجھتے ہیں

جس کے ساتھ انہوں نے مصر کی اطاعت پذیری کا عہدنامہ کیا تھا۔ لیکن حقیقت میں یہ شخص سرس ہی تھا جس کے متعلق متوقس کے نام سے بے شمار روایات اور افسانے مشہور ہیں۔ سب سے پہلے قبطی روایات میں یہ نام محض ایک معمہ بن گیا ہے اور اسے حل کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ سرس اور متوقس ایک ہی شخص کے نام ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس مجہول لفظ مقوقس میں کوئی بازنطینی خطاب پوشیدہ ہے یا حقارت سے اسے یہ نام دیدیا گیا ہے یا اس لفظ کے کوئی خاص معنے تھے۔ ان سوالوں کا جواب فی الحال نہیں دیا جا سکتا۔

مصر کے فاتح عمرو بن عاص تھے وہ شام میں بھی لڑ چکے تھے۔ انہیں مدینہ کی حکومت میں بہت رسوخ اور اثر حاصل تھا لیکن نہ تو بظاہر ان میں مذہبی جوش تھا اور نہ وہ زبردست سپہ سالار ثابت ہوئے تھے۔ لیکن ان میں سے سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ایک عظیم الشان منتظم تھے، اور سیاسیات کے داؤ پیچ سے بخوبی واقف تھے۔ ان میں جاہلیت کی عملی چال بازیاں اور عربوں کی خوداعتمادی بدرجہ اتم موجود تھیں۔ دسمبر ۶۳۹ء میں عمرو بن عاص مصر کی مشرقی سرحد پر جو اس وقت فوج سے بالکل خالی تھی، اچانک ظاہر ہوئے اور تقریباً ایک ماہ بعد جنوری ۶۴۰ء میں تین یا چار ہزار کی فوج سے انہوں نے فرما (Pelusium) فتح کر لیا۔ فیصلہ کن جنگ کی ہمت وہ اس وقت کر سکے جب آنحضرت کے مشہور صحابی حضرت زبیر کی ماتحتی میں پانچ ہزار کمک ان کے پاس پہنچ گئی۔ اس فوج کی مدد سے جولائی ۶۴۰ء میں انہوں نے اس بازنطینی فوج کو شکست دی جو آگستلس تھیوڈوارس کے ماتحت ان کے مقابلے کے لئے آئی تھی یہ جنگ عین الشمس (Heliopolis) میں ہوئی جو بابلیون کے مضافات میں تھا۔ بابلیون ہی کا نام بعد میں قاہرہ ہوا۔ گو یہ شہر اس وقت مصر کا دارالسلطنت نہیں تھا لیکن ڈلٹا کے سرے پر واقع ہونے کی وجہ سے اسکندریہ کے بعد ملک کا سب سے بڑا اہم مقام سمجھا جاتا تھا، اور اسکی قلعہ بندی بھی نہایت استحکام سے کی گئی تھی۔ اس لئے بابلیون کی مقیم فوج نے کچھ مدت تک حملہ آوروں کی مزاحمت کی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سرس قلعے میں موجود تھا۔ اس نے سخت ترین مخالفت کے باوجود عمرو بن عاص سے خط و کتابت شروع کی، اور بالآخر دونوں میں جو معاہدہ طے ہوا تھا اسکی توثیق قیصر سے کرانے کے لئے وہ قسطنطنیہ چلا گیا۔ ہرقل کو اس معاہدہ پر سخت غصہ آیا۔ سرس کی

غداری کا الزام لگا کر اسے جلاوطن کر دیا گیا۔ اس کے بعد ۱۱ فروری ۶۴۱ء کو ہرقل کا انتقال ہو گیا
اب بظاہر بابلیون کو مدد ملنی ناممکن تھی۔ ادھر مصر کی یہ حالت تھی کہ گو بعض لوگ قسطنطنیہ کے وفادار رہے
لیکن ان لوگوں کی طرف سے جو مسلمانوں کے ساتھ اتحاد کے خواہاں تھے بدترین قسم کی سازشیں شروع
ہوئیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہرقل کی موت کے بعد طرح طرح کے شدید ہیجانات نے مصر میں سر اٹھایا
تھا، اور ان کی وجہ سے اس وقت مسلمانوں کے خلاف کسی پرجوش مقاومت کا ذکر ہی بیکار تھا۔ اس طرح
مجبوراً اپریل ۶۴۱ء میں بابلیون کی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس واقعہ سے ڈلٹا کا مغربی حصہ اور
مصر صعید عمرو بن عاص کے ہاتھ آیا۔ اب انہوں نے دریائے نیل کو عبور کیا، اور دریا کے مغربی نہر کے
ساتھ کوچ کر کے نیکو (Nikiu) پہنچے، جو ایک اسقفیہ کا مرکز تھا۔ ۱۳ مئی کو نیکو نے بھی مسلمانوں کی
اطاعت قبول کر لی۔ اب حضرت عمرو بن عاص اسکندریہ کی طرف بڑھے۔ مصریوں کی غداری اور
خوف نے اُن کا راستہ صاف کر دیا لیکن اسکندریہ کے گرد و نواح میں معلوم ہوتا ہے کہ انہیں سخت مزاحمت
پیش آئی۔ حضرت عمرو بن عاص نے نواحی علاقے پر تو عارضی قبضہ کر لیا لیکن اسکندریہ کے قلعہ بند
شہر پر قبضہ کرنا بالکل دوسری چیز تھی۔ تمام مصر پر مسلمانوں کی بتدریج ترقی کی تفصیل ہمیں معلوم نہیں۔

ہرقل کی موت کے بعد قسطنطنیہ میں جو اضطراب پیدا ہوا اس میں فوجی جماعت یہ چاہتی تھی
کہ اگستلس تھیودورس کو دوبارہ مصر بھیجا جائے لیکن قیصرہ مارتینہ عربوں کی اس مسلسل جنگ سے
تنگ آ گئی تھی۔ اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ سرس دوبارہ مصر جائے اور حضرت عمرو بن عاص سے جو بہترین
شرائط حاصل ہو سکیں انہیں قبول کر لیا جائے۔ ۱۴ ستمبر کو سرس دوبارہ مصر پہنچا۔ اس کے بعد ہمیں علم نہیں کہ
اس نے کیا کیا۔ بہرحال اب بھی قبطیوں نے پہلے کی طرح اسکی غیر معمولی مخالفت کی اور یہ بھی زیادہ
بعید از قیاس نہیں کہ سرس خود اس کا خواہش مند تھا کہ مسلمانوں کے تحت اسے مصر کی کلیسائی حکومت کا
مقتدرِ اعلیٰ بنا دیا جائے۔ موسم خزاں میں اس نے اہل اسکندریہ کے علم کے بغیر حضرت عمرو بن عاص سے
آخر اطاعت پذیری کا معاہدہ مکمل کر لیا۔ اس معاہدہ کے مطابق ۱۷ ستمبر ۶۴۲ء تک یونانیوں کو
اسکندریہ خالی کر دینا چاہیئے تھے لیکن ایک مقررہ خراج کے بدلے میں اہل شہر کی جان و مال کی حفاظت

اور مذہبی آزادی کا ذمہ فاتحین نے لیا۔ معاہدہ کی خبر جب پھیلی تو بطریک کے جان کے لالے پڑ گئے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جلد لوگوں کو سرس کی پیش بینی اور دوراندیشی کا یقین دلایا گیا۔ یونانیوں نے شہر خالی کر دیا۔ سرس خود بھی زیادہ دن تک زندہ نہیں رہا۔ ۲۱ مارچ ۶۴۲ء ہی کو اس کا انتقال ہو چکا تھا۔ مصر کا صدر مقام فتح ہو چکا تھا اور حضرت عمرو بن عاص واپس جا سکتے تھے لیکن اس کے بجائے آئندہ سال ۶۴۲ء۔ ۶۴۳ء میں پنٹ پولس (Pentapolis) پر فوج کشی کی، اور بغیر کسی بڑی مزاحمت کے برقہ فتح کر لیا۔

جس طرح مسلمانوں نے اس سے قبل طیسفون کو ترک کر دیا تھا اسی طرح مصر میں بھی اسکندریہ کو نئی حکومت کا صدر مقام منتخب نہیں کیا گیا خلفاء کی حکمت عملی ہمیشہ یہ تھی کہ بیرونی ممالک میں جہاں تک ہو سکے عربوں کو بالکل الگ رکھا جائے اس لئے یہاں بھی کوفہ اور بصرہ کی طرح فاتحین نے قدیم بابلیون کے قریب دریائے نیل کے مشرقی کنارے پر اپنی چھاؤنی کو ایک مستقل شہر قرار دیا اور اس کا نام فسطاط (یعنے خیمہ) رکھا اس شہر کے محلوں کے متعلق جو تفصیلات ہمیں معلوم ہوئی ہیں ان سے ہم ان عرب قبائل کے نام بتا سکتے ہیں جنہوں نے فتح مصر میں حصہ لیا تھا۔ یہ قبائل زیادہ تر جنوبی عرب کے تھے۔ یہ فرض کر لینا زیادہ غلط نہیں ہوگا کہ فسطاط کی ابتدا یونانیوں کے اسکندریہ خالی کر دینے کے بعد ہوئی (۶۴۲ء)

فاتح مصر کا وہی حیرت انگیز انجام ہوا جو ان کے ہم کار فاتح شام کا ہو چکا تھا۔ حضرت عمر کی حکمت عملی یہ تھی کہ وہ اپنے نائبین کو اس وقت رکھتے تھے جب تک کہ وہ خود مختاری کے قابل نہ ہو جائیں۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی وفات سے کچھ ہی مدت قبل انہوں نے مصر صعید کو الگ ایک صوبہ بنا کر عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو وہاں کا حاکم مقرر کر دیا۔ وہ براست مرکزی حکومت کے ماتحت تھے لیکن انہیں فوج پر کوئی اقتدار حاصل نہیں تھا۔ حضرت عمر کی وفات کے بعد حضرت عثمان نے انہیں کو مصر اسفل کا بھی حاکم بنا دیا اور عمرو بن عاص کو واپس بلا لیا۔ دوسری طرف قسطنطنیہ میں شورش کے بعد دوبارہ امن قائم ہوا تو مینُول کی سرکردگی میں ایک بازنطینی بیڑا اچانک اسکندریہ کے

سامنے ظاہر ہوا، اور شہر میں بغاوت برپا ہو گئی (۶۴۵ء) عبداللہ بن سعد اس نئے خطرے سے عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ خود فوج کے کہنے سے حضرت عثمان نے کارآزمودہ عمرو بن عاص کو دوبارہ مصر بھیجا۔ انہوں نے تھوڑے ہی عرصہ میں بازنطینیوں کو مصر سے نکال دیا۔ اور اسکندریہ کو دوبارہ بزور شمشیر فتح کر لیا (۶۴۶ء) لیکن اس کے بعد عمرو بن عاص نے پھر مصر عبداللہ بن سعد کے حوالے کر دیا۔ شہری انتظام میں دخیل ہوئے بغیر عمرو بن عاص سپہ سالار کی حیثیت سے وہاں رہے۔ فاتح سپہ سالاروں کا مقصد یہ تھا کہ محاصل حاصل کر کے ملک سے فائدہ اٹھائیں اور اس وقت وہ یہ کر سکتے تھے۔ عبداللہ بن سعد خلیفہ عثمان کے رضاعی بھائی تھے لیکن باوجود اس کے مالیات کا کام ان کے سپرد تھا۔ انہوں نے یہ فرض خوب انجام دیا اور سرحد کو وسیع کرنے میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ انہوں نے نوبہ سے ایک معاہدہ کر کے مصر کی سرحد کو منظم کیا (اپریل ۶۵۲ء) اور مغرب میں طرابلس الغرب تک بڑھتے چلے گئے۔ لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ ایک جنگی بیڑے کی تکمیل ہے۔

اس معاملے میں امیر معاویہ شام میں عبداللہ بن سعد کے نقش قدم پر چل رہے تھے، کیونکہ شام میں بھی جہاز سازی کا کام شروع ہو رہا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسکندریہ کو سب سے بڑی گودی قرار دیا گیا تھا اور ہر بڑی بحری جنگ میں اب شامی اور مصری بیڑے پہلو بہ پہلو لڑتے نظر آتے ہیں۔ عربی تاریخوں میں بحری مہموں کو خلاف توقع اور حیرت انگیز طور پر نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ یورپی ماخذوں میں عربوں کی ان کامیابیوں کو بہت نمایاں جگہ دی گئی ہے۔ فافیر پر لکھے ہوئے جو اسناد گذشتہ چند سال میں دریافت ہوئے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ ساتویں صدی کے آخر میں بیڑوں کی تعمیر اور انہیں ساز و یراق سے آراستہ رکھنے کا انتظام سلطنت کے نظم و نسق کا ایک اہم صیغہ سمجھا جانے لگا تھا۔ امیر معاویہ کو بیڑے کی اس وجہ سے ضرورت تھی کہ بازنطینیوں کا مقابلہ کیا جا سکے، کیونکہ جب تک بازنطینی تمام سمندر کے تنہا مالک بنے رہیں اس وقت تک شام کو ہرگز محفوظ نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ بالکل یہی حال اسکندریہ کا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ امیر معاویہ کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ بازنطینی خطرے کا مقابلہ کیسے کیا جائے۔ یہ حکومت اس وجہ سے اور بھی باعث خطرہ تھی کہ اس کا بحری مرکز قبرص شام کے ساحل کے بہت ہی

قریب واقع ہے۔ چنانچہ عربوں کی پہلی بحری مہم ۴۹ھ کے موسم گرما میں قبرص ہی کے خلاف بھیجی گئی تھی جو فتح و ظفر کے بعد واپس آئی۔ اس کے ایک سال بعد شام کے قریب کا علاقہ ارادوس Aradus فتح ہوا۔ ۵۵ھ میں امیر معاویہ نے قسطنطنیہ کے خلاف ایک مہم تیار کی اس میں مصری جہازوں نے بھی حصہ لیا۔ فونکس (Phonix) کے ساحل پر جسے عرب ذات الصواری کہتے ہیں ایک زبردست جنگ ہوئی۔ اس کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہ تھا کہ قیصر کونسٹنس (Constans) ثانی بذات خود اپنی فوج کا سپہ سالار تھا۔ عربوں کا امیر البحر ایک شخص ابوالاعور، یا ایک روایت کے مطابق مصر کے حاکم عبداللہ بن سعد تھے۔ جنگ کے متعلق قابل اعتماد تفصیلات مفقود ہیں۔ بہرحال اتنا معلوم ہے کہ یہ جنگ یونانیوں کی ایک سخت شکست پر ختم ہوئی، جسے یرموک کے برابر کا حادثہ سمجھنا چاہیئے۔ بازنطینیوں کا زبردست بیڑا، جس کی تعداد کم و بیش پانچ سو جہاز بیان کی جاتی ہے، بالکل فنا ہو گیا، اور قیصر نے بھاگ کر اپنی جان بچائی۔ لیکن بظاہر عربوں نے اس عظیم الشان فتح سے کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی اور نہ قسطنطنیہ پر حملہ کیا۔ بازنطینیوں کی خوش قسمتی تھی کہ اس واقعہ کے بہت جلد بعد حضرت عثمانؓ کی شہادت واقع ہوئی۔ اور مسلمانوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ چوں کہ امیر معاویہ خود اس میں شریک تھے۔ اس لئے انہوں نے مجبوراً بازنطینیوں کے ساتھ ایک شرمناک صلح کر لی

بعد کے زمانے میں امیر معاویہ نے نئے سرے سے بازنطینیوں کے خلاف فوجی مہموں کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ مہمیں بحری راستے بھی بھیجی گئی تھیں، اور ارمنیہ اور سلیسیا کے راستوں سے بھی ۴۲ھ ہی میں میسوپوٹامیا کے قبضے کے بعد عربوں نے بازنطینی ارمینیہ کو فتح کرنے کی کوشش کی تھی، اور حبیب بن مسلمہ کے تحت ایک مہم وہاں بھیجی تھی۔ اس کے صدر مقام ڈوین کو جو دریائے ارکسیس کے شمال میں واقع تھا عارضی طور پر فتح کر لیا گیا تھا۔ اس کے بعد جو مہمیں بھیجیں گئیں ان کا انجام کچھ زیادہ خوش آیند نہیں ہوا، کیونکہ ایک ارمنی امیر تھیوڈور کو بازنطینیوں نے اپنی فوجوں سے مدد پہنچائی اور اسے بطریق کا خطاب دے کر اسکی ہمت افزائی کی۔ اس نے عربوں کی سخت مزاحمت کرنے کی ٹھانی مگر انجام یہ ہوا کہ اسی تھیوڈور نے عربوں سے صلح کر لی اور ان کے زیر سیادت زندگی بسر کرنے پر رضامند ہو گیا۔ اب پھر

بازنطینی فریق کی موافقت میں ایک ردعمل شروع ہوا، اور عربوں کی مزاحمت کی تیاریاں ہونے لگیں، کیونکہ یہ لوگ اس وقت حبیب بن مسلمہ کی سرکردگی میں کاکےسوس تک بڑھ آئے تھے، انہیں ازربائیجان سے فوجیں پہونچ رہی تھیں، جو مفتوحہ ایران سے گذر کر آتی تھیں۔ یہ فوجیں کاکےسوس کو عبور کر چکی تھیں۔ مگر یہاں خزر کے ہاتھوں بالکل تباہ ہوگئیں۔ اس کے علاوہ ارمینیہ میں عرب صرف خانہ جنگی کے شروع ہونے تک ٹھیر سکے۔ جب اسلامی دنیا میں پھر اتحاد قائم ہوگیا تو عہد اموی کے پورے دور میں ہر سال بحری اور بری مہمیں بھیجنا حکومت کا ایک مخصوص فرض ہوگیا۔ یہ مہمیں صرف اسی صورت میں بند ہوتی تھیں کہ دونوں سلطنتوں میں عارضی صلح ہو جائے۔ فافیر کے اسناد سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ سالانہ موسم گرما کی مہموں کے لئے جو فوجیں (جیش) بھیجی جاتی تھیں ان کے لئے ایک خاص محصول عائد کیا گیا تھا۔ یہ باضابطہ فوجی کوچ مشرق قریب میں دو سمتوں میں ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ شمالی افریقہ کی سمت میں اور ۱۱۷ھ کے بعد اندلس پر حملے ہوئے، جیسا کہ ہم آیندہ تفصیل سے بیان کریں گے، اور دوسری سمت شمال میں ایشائے کوچک اور ارمینیہ تھے جن پر حملے ہوا کرتے تھے۔

فطری طور پر عربوں کو قسطنطنیہ فتح کرنے کی بڑی ہی آرزو تھی، اور متعدد مرتبہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ آرزو پوری ہوگئی۔ دو دفعہ خود امیر معاویہ کے زیر ہدایت یہ مہمیں بھیجی گئیں۔ پہلی مرتبہ یہ مہم جو زیادہ تر بری تھی، فضالہ کے ماتحت بھیجی گئی۔ اس نے ۶۶۸ء میں کلسی دون فتح کیا، اور ۶۶۹ء کی ابتدا میں خلیفہ کے بیٹے یزید کی مدد سے اس فوج نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا۔ بہرحال یہ مہمیں اپنے مقصد میں خواہ کتنی ہی ناکام رہی ہوں، لیکن دونوں اسلامی اور مسیحی بیڑوں کی مسلسل آویزشیں سات برس جاری رہیں اور ۶۷۴ء میں شروع ہوکر امیر معاویہ کی وفات سے ذرا قبل ۶۸۰ء میں ختم ہوئیں۔ فوجیں بھی قسطنطنیہ کے قریب پڑی رہیں، جہاں مسلمانوں نے اپنا ایک بحری مرکز قائم کر لیا تھا۔ پھر جب مسلمانوں کی خانہ جنگی ختم ہوئی تو عرب حکومت کی توسیع کے دو سیلاب خلیفہ ولید کے عہد میں نئے سرے سے شروع ہوئے۔ ان میں سب سے زیادہ قابل توجہ ۷۱۶ء سے ۷۱۷ء تک کا محاصرہ قسطنطنیہ ہے جو ولید کے جانشین خلیفہ سلیمان کے زمانے میں پیش آیا۔ یہ محاصرہ بھی عربوں کی سخت

ناکامی پر ختم ہوا، اور عربوں کی سرحد اس وقت بھی عمان اور کاکے سوس ہی رہی گو یہ سرحد دونوں حکومتوں کی قوت اور کمزوری کے لحاظ سے ذرا ذرا بدلتی رہتی تھی لیکن ان مسلسل جنگوں کا تعلق درحقیقت بازنطینی حکومت کی اندرونی تاریخ سے ہے۔ اس لئے ہم یہاں ان کی تفصیلی بیان نہیں کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان علاقوں میں عربوں کی توسیع اس درجے کو پہنچ چکی تھی کہ مدتوں تک اس میں اضافہ ناممکن تھا۔

لیکن در اصل شرقیین اور بازنطینیوں کے تعلقات پر بحث کرتے کرتے ہم اپنے اصل موضوع سے بہت دور جا پڑے ہیں۔ اب ہم پھر خلافت کے واقعات کی طرف عود کرتے ہیں۔ حضرت عمر کی خلافت پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن کے اور ان کے جانشین کے زمانے میں عربوں کی توسیع ایک طویل مدت تک کے لئے اسی پرانی سرحدوں تک باقی رہی۔ پھر اس نئی سلطنت کا قیام و استحکام بھی یورپ کی ازمنۂ وسطےٰ کی تاریخ سے وابستہ ہے، اور جب تک اُسے نہ سمجھ لیا جائے بحیرۂ روم کے علاقوں میں عربوں کی توسیع پر پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس کے علاوہ یورپ عربوں کی خانہ جنگی سے بے فکر نہیں رہ سکتا تھا، کیونکہ اس کا بڑا گہرا اثر بازنطینی اور فرانسیسی حکومتوں پر پڑتا تھا، بلکہ یورپ اس نئی حکومت کی زد میں تھا۔ لیکن مسلمانوں کی خانہ جنگی کی وجہ سے یہ تمام تحریک یکبارگی رک گئی۔ اسی زمانے میں ہمارے کان اسلامی تہذیب کے الفاظ سے آشنا ہوتے ہیں۔ اس تہذیب کو اگر پوری طرح نہ سمجھا جائے تو تاریخ کا حقیقی تسلسل ٹوٹ جاتا ہے اور مشرق میں جو تحریک عمل جاری تھی، اور جس کا اثر یورپ کے ازمنۂ وسطےٰ پر پڑ رہا تھا، وہ پوری طرح سمجھ میں نہیں آئے گی۔

عین اس وقت جب حضرت عمر اپنی زندگی کے بہترین کارناموں میں مصروف تھے دارالخلافہ ہی میں اچانک وہ ایک ایرانی غلام کے خنجر کا شکار ہوئے (۳ نومبر ۶۴۴ء)۔ حضرت ابوبکر نے ایک معمولی نامزدگی کے ذریعے حضرت عمر کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ لیکن حضرت عمر کی جانشینی کے وقت حالات ایسے تھے کہ عام طور پر جانشینی کا فیصلہ ایک مشکل امر سمجھا جاتا تھا۔ وفات کے وقت حضرت عمر نے کسی کو اپنا جانشین بنانا اپنے ذمہ نہیں لیا، کیونکہ ان جیسا سخت گیر، صداقت پسند، متدین اور

مخلص شخص ان لوگوں میں سے جو کم و بیش اس عظیم الشان کام کے نااہل تھے کسی کو منتخب کرکے عین اس وقت جب موت سر پر کھڑی تھی اپنی عاقبت کو جوکھم میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ انہوں نے یہ انتظام کیا کہ چھ مشہور و معروف صحابہ کی ایک مجلس شوریٰ بنائی اور اس کا مقصد یہ مقرر کیا کہ اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کرلیں۔ اس طرح اب اسلام کی آئندہ قسمت حضرات علی، عثمان، طلحہ، زبیر، سعد بن ابی وقاص اور عبدالرحمٰن بن عوف کے ہاتھ میں آئی۔ بہت کچھ توقف کے بعد سب لوگ حضرت عثمان پر متفق ہوئے۔ اسکی وجہ غالبًا یہ تھی کہ وہ لوگ جانتے تھے کہ ان میں یہی حضرت عثمان سب سے زیادہ کمزور اور سیدھے سادے ہیں، اور ان میں سے ہر ایک حضرت عثمان کے پردے میں خود حکومت کریگا۔ یہ انتخاب دراصل ایک ردعمل معلوم ہوتا ہے۔ لوگ حضرت عمر کی مطلق العنانہ طرز حکومت اور انکی سخت گیری سے ایک حد تک گھبرا گئے تھے وہ چاہتے تھے کہ ذاتی طور پر قوت و اثر حاصل کرنے کا موقع ملے اور مذہبی اور سیاسی لحاظ سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نائبین کا اثر کم ہو۔ یہ خیال خاص طور پر ان فاتح سپہ سالاروں کا تھا، جو اس وقت کار آزمودہ زبردست فوجوں کے افسر تھے۔ اب صاف ظاہر تھا کہ حضرت عثمان کی کمزوری سے جو جد و جہد شروع ہوگی اس کا مقصد صرف یہ ہوگا کہ جہاں تک ہوسکے ایک خاص خاندان کو فائدہ پہنچے۔ حضرت عثمان بنی امیہ سے تعلق رکھتے تھے یعنے ان کا تعلق مکہ کی قدیم شرفاء کی جماعت سے تھا، جو ایک مدت تک آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سخت مخالف رہی تھی اور جب آپ کو پوری کامیابی ہوئی تھی تو سیاسی نقطۂ نظر سے انہوں نے بہتر سمجھا تھا کہ آپ کے ساتھ مل جائیں۔ چنانچہ یہ لوگ نقل مکان کرکے اس نئی مذہبی برادری میں شریک ہوگئے تھے جو اسلام کی وجہ سے مدینہ میں قائم ہوئی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لطف و کرم سے پورا فائدہ اٹھائیں۔ یہ مقصد انہیں پوری طرح حاصل ہوگیا تھا۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ یہی لوگ فہم و فراست میں سب سے بڑھے ہوئے تھے اور اس کے ساتھ ہی سازش میں بھی طاق تھے اور دھمکیاں بھی دے سکتے تھے۔ ان خصائل کے ذریعے صحابہ کے زمرے میں بھی شامل ہوگئے مگر صحابہ ان کا مقابلہ نہ کرسکے۔ دوسری طرف یہ باتیں دیکھ صحابہ نے بھی حضرت

عثمان کو انکی حالت پر چھوڑ دیا۔ ادھر حضرت عثمان نے اپنے چچازاد بھائی مروان بن حکم کو اپنا معتمد خاص نامزد کیا۔ اور وہ بہت زیادہ طاقتور ہوگیا۔ اب تمام بڑے بڑے اور با اقتدار عہدے بنی امیہ یا انکے ہمدردوں کو دیئے جانے لگے۔

آخر اس خاندان پرستی کی وجہ سے حضرت عثمان کو ہر طرف سے اکیلا چھوڑ دیا گیا اور اسی خاندان پرستی کی وجہ ایک زبردست بے چینی تمام سلطنت میں پیدا ہوئی۔ مگر بے چینی کی یہی ایک وجہ نہ تھی۔ حضرت عمر نے جو مالی انتظامات کئے تھے، اور جنہیں حضرت عثمان نے جوں کا توں برقرار رکھا تھا، ان کا ردعمل بھی بیش از بیش ہو رہا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ مال غنیمت کی محبت نے عربوں کو اپنے گھر سے نکالا تھا اور خمس الگ کرنے کے بعد تمام مال غنیمت انہیں کا حصہ ہوتا تھا۔ لیکن ان علاقوں کا کیا حشر ہوا جو فتوحات کے دوران میں عربوں نے تھوڑی مدت میں حاصل کر لئے تھے، اور اس خراج کا کون مالک تھا جو مفتوحہ اقوام سالانہ ادا کرتی تھیں؟ فاتحین چاہتے تھے کہ مختلف علاقوں میں سے انہیں بھی حصہ دیا جائے لیکن عرب آبادی کے مسلسل نقل مکان کرنے کی وجہ سے ان کا حصہ انہیں پہنچایا جانا مشکل ہی نہیں بلکہ محال تھا اور اس قسم کی تقسیم خود حکومت کے لئے بہت نامبارک ثابت ہوتی۔ اس لئے حضرت عمر نے ایک نیا مالی محکمہ بنایا۔ نئی قائم شدہ چھاؤنیوں، یعنی کوفہ اور بصرہ کے رہنے والوں کو مقررہ تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ اور اس کے بعد جو محاصل بچ رہتے تھے وہ مدینہ بھیج دیئے جاتے تھے۔ لیکن حضرت عمر ان رقموں کو جمع نہیں کرتے تھے بلکہ سرکاری وظائف کے طور پر انہیں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ تقسیم خود خلیفہ کے اختیار تمیزی پر موقوف تھی اور حکومت کے اراکین میں ان کے رتبے اور عزت کے مطابق عمل میں آتی تھی۔ حضرت عمر کا زمانہ ہر طرح کی فرقہ بندی کی آلائشوں سے پاک تھا۔ اس لئے کسی کو شکایت کا موقع نہیں ملا خصوصاً اس وجہ سے کہ ان کے زمانے میں مال غنیمت کی مقدار بڑھتی ہی چلی گئی۔ لیکن جب حضرت عثمان کا زمانہ آیا یہ رقم برابر کم ہوتی چلی گئی اور آخر بالکل ختم ہوگئی۔ اب عرب قبائل نے یہ کوشش کی کہ اس مالی نظام کو صوبہ واری قرار دیا جائے۔ اس کے علاوہ حضرت عثمان کی خاندان پرستی سے مخالفین اور بھی بھڑک اٹھے اور آخر یہ بے چینی کھلم کھلا بغاوت کی صورت میں

ظاہر ہوئی۔ مخالفین کا مقصد یہ تھا کہ حضرت عثمان کے خلاف ایک حقیقی جہاد کا اعلان کیا جائے۔ سب سے پہلے اہل کوفہ نے ۶۵۵ء میں حضرت عثمان کے حاکم کے خلاف غدر کیا۔ اس وقت خلیفہ نے بے انتہا کمزوری سے کام لیا، اور فوراً اپنے نامزد کردہ حاکم کو واپس بلا لیا۔ مگر سب سے زیادہ زبردست غدر مصریوں کی طرف سے ہوا یہ لوگ اپریل ۶۵۵ء میں پانچ سو کی تعداد میں مدینہ پہونچے۔ اب یہاں جو بدامنی ہوئی اس کے بڑھانے میں خفیہ طور پر اہل مدینہ نے حصہ لیا۔ یہ حضرات اس بدامنی کے حقیقی محرک تھے جو صوبہ کے رہنے والوں نے مدینہ میں برپا کی، حالانکہ ذاتی طور پر انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا [!!] آخر بہت کچھ گفت و شنید کے بعد مصریوں نے حضرت عثمان کے محل کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت بھی اہل مدینہ بیٹھے تماشا دیکھتے رہے حالانکہ وہ ذرا سی کوشش سے خلیفہ کو بچا سکتے تھے۔ یہ واقعہ درحقیقت انہیں حضرات کی وجہ سے ہوا [!!] آخر شورشیوں نے حضرت عثمان کے محل پر حملہ کیا، اور بے یار و مددگار بوڑھے خلیفہ کو قتل کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۶ر جولائی ۶۵۶ء کو پیش آیا۔

اب نئی تبدیلیوں اور نئے فیصلوں کا وقت آ گیا تھا۔ اہل مدینہ کے مطابق بلاشک و شبہ حضرت علی ہی اب اکیلے خلافت کے مستحق تھے اس لئے فوراً ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی گئی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا تمام بنی امیہ اور بالخصوص شام کے طاقتور حاکم امیر معاویہ، حضرت علی کو حضرت عثمان کا حقیقی قاتل نہیں سمجھتے تھے؟ امیر معاویہ شام میں اپنی جگہ پر جمے بیٹھے تھے اور صرف اسی بہانے سے جو ان کے لئے حقیقت میں بہانے سے کچھ ہی زیادہ وقعت رکھتا تھا، اس خطرے میں پڑ سکتے تھے کہ خلافت کے لئے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے داماد کا مقابلہ کریں لیکن یہ بات نہیں تھی کہ صرف بنی امیہ ہی حضرت علی کے مخالف تھے۔ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر جو اب تک حضرت علی سے متفق رہے تھے اور ان کے دوست تھے، اب انہوں نے مخالفت شروع کی، حالانکہ حضرت علی کے مقابلے میں انہیں کوئی خاص درجہ حاصل نہ تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت عائشہ نے طلحہ اور زبیر کا ساتھ دیا۔ ان مخالفین نے اہل بصرہ کو اپنا ہمدرد بنایا، اور حضرت علی نے اہل کوفہ سے مدد مانگی اور ان میں مسلح ہونے پر آمادہ کیا۔ بصرہ کے قریب فیصلہ کن معرکہ ہوا جو اس وجہ سے جنگ جمل کے نام سے مشہور ہے کہ حضرت عائشہ قدیم عربی قاعدے کے مطابق ایک اونٹ پر سوار اس جنگ میں شریک تھیں۔ حضرت علی کو فتح ہوئی۔ حضرت عائشہ اس کے بعد عام سیاسی معاملات سے بالکل کنارہ کش ہو گئیں۔ حضرت

طلحہ اور حضرت زبیر دونوں جنگ میں کام آئے۔ یہ ۹، دسمبر ۶۵۶ء کا واقعہ ہے۔ حضرت علی اب عراق کے مالک تھے، اور انہوں نے کوفہ کو اپنا دارالخلافہ مقرر کیا۔

دارالخلافہ کی اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں تک حکومت کے مرکز کا تعلق تھا عرب کی سیاسی حیثیت اب ختم ہو گئی۔ مدینہ اب ایک صوبہ واری شہر ہو گیا، اور وہاں کے رہنے والوں کی زندگی کا دارومدار محض زہد و تقوی پر رہ گیا۔ مشرق قریب پھر ایک مرتبہ قبل اسلام کی طرح تاریخ عالم میں اس طرح نمودار ہوا کہ عراق اور شام میں جنگ چھڑ گئی۔ سلطنت کے دونوں حصوں نے حکومت حاصل کرنے کے لئے لڑائی کی تیاری شروع کی۔ اور دنیا نے یہ تماشا دیکھا کہ مسلمان مسلمان کے مقابلے کے لئے کمر بستہ ہو رہے ہیں۔ آخر کار شام کی ضبط و تنظیم اور مدنیت، اسکی کامیابی کا سبب بنی۔ لیکن عراق کو تھوڑی مدت کے لئے جو سیاسی تفوق حاصل ہو گیا تھا وہ بنیاد بنا اس تحریک کا جو عہد اموی میں وہاں برابر زور پکڑتی رہی، اور آخر نو تعمیر شدہ عالمگیر ایشائی حکومت کا صدر مقام پھر ایک مرتبہ بابل کے قریب قائم ہوا۔

جنگ جمل کے بعد حضرت علی کی حالت بڑی حد تک سنبھل گئی تھی، کیونکہ جب تک مصر پر حضرت علی کا قبضہ تھا امیر معاویہ ان کے خلاف سرگرمی اور مستعدی سے کام نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن امیر معاویہ کی نظر لازماً مصر پر تھی، اور اس معاملے میں انہیں مصر کے فاتح حضرت عمرو بن عاص سے بہت مدد ملی۔ وہ اس اثنا میں امیر معاویہ سے مل گئے تھے اور انکی طرف سے مصر پر دوبارہ حکومت کرنے کے خواہاں تھے۔ اس لئے انہوں نے حضرت علی کے خلاف جنگ میں حضرت امیر معاویہ کی نہایت گراں قدر خدمت انجام دی۔ حضرت علی امیر معاویہ کے خلاف روانہ ہوئے تو دونوں فوجیں شام کی سرحد پر رقہ کے قریب صفین کے مقام پر آمنے سامنے آئیں طول طویل نامہ و پیام کے بعد ۲۶ ہر ۲۷، جولائی ۶۵۷ء کو اسی مقام پر ایک جنگ ہوئی عین اس وقت جب حضرت علی کی فتح اٹل معلوم ہوتی تھی، عمرو بن عاص کو ایک خیال آیا، اور ان کے حکم سے قرآن شریف نیزوں پر بلند کیا گیا اور اعلان کیا گیا کہ کتاب اللہ فریقین میں فیصلہ کرے گی۔

یہ حیلہ کامیاب ہوا۔ حضرت علی کو ناچار اپنی فوج کی رفتار روکنی پڑی۔ اب فیصلہ ہوا کہ حکم مقرر کئے جائیں امیر معاویہ نے فوراً عمرو بن عاص کو اپنا نمائندہ مقرر کر دیا اور حضرت علی کو طوعاً و کرہاً ابو موسیٰ الاشعری کو

مقرر کرنا پڑا، حالانکہ وہ قابلِ اعتماد نہیں سمجھے جا سکتے تھے۔ ابھی تمام باتوں کا فیصلہ ہو ہی رہا تھا کہ حضرت علی کی فوج میں اختلاف شروع ہو گیا ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ انہوں نے انسانوں کے سامنے سر جھکایا ہے اور تمام فیصلہ خدا اور تلوار کے ہاتھ میں نہیں چھوڑا۔ فوج کے ہزاروں آدمی حضرت علی سے الگ ہو گئے اور حروراء کے مقام پر انہوں نے اپنی چھاؤنی بنا لی۔ اس وجہ سے یہ لوگ حروری کہلاتے ہیں، اور انہیں کو خارجی بھی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے حضرت علی کی انتہائی مخالفت شروع کی، اور انہیں مجبور ہونا پڑا کہ نہروان کے مقام پر ان لوگوں کی زبردست قوت کو توڑیں (۱۷ جولائی ۶۵۸ء) بعد میں یہ لوگ بے شمار چھوٹے چھوٹے فرقوں میں منقسم ہو گئے۔ اور حضرت علی اور حضرت معاویہ کو بے انتہا تنگ کیا۔ یہ لوگ درحقیقت عرب جاہلیت کے حقیقی نمائندے تھے اور اس عہد کی طرح تاخت و تاراج کے دلدادہ تھے۔ فرق یہ تھا کہ وہ اب یہ کام مذہب کی آڑ میں کرتے تھے۔ ان کے باقی ماندہ لوگ اب بھی اباضیہ کے نام سے جنوبی عرب اور مشرقی اور شمالی افریقہ میں پائے جاتے ہیں۔

حکمین کے متعلق پوری تفصیل یقین کے ساتھ معلوم نہیں۔ بہرکیف عمرو بن عاص کی شاطرانہ چال کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے ساتھی ابوموسیٰ الاشعری نے یہ منظور کر لیا کہ حضرت علی اور حضرت معاویہ کو ہم سر سمجھ لیا جائے جس کے مطابق حضرت علی کی خلافت سے دست برداری مسلم ہو گئی۔ حکمین کا فیصلہ اَذرُح کے مقام پر ۶۵۸ء میں صادر ہوا۔ یہ فیصلہ بذات خود حضرت علی کے لئے کچھ کم تکلیف دہ نہیں تھا لیکن اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ مصر ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ کیونکہ فیصلے کے بہت جلد بعد عمرو بن عاص نے اس ملک کو فتح کر لیا اور اپنی موت تک وہ وہاں بجائے حاکم صوبہ ہونے کے نائب بادشاہ بنے رہے۔ لیکن حکمین کی گفت و شنید سے یہ نتیجہ نہیں نکلا کہ حضرت علی اور امیر معاویہ کے درمیان کوئی قطعی اور غیر مبہم فیصلہ ہو جاتا۔ اس کے بعد بھی دونوں میں توازن قوت باقی رہا۔ بہرحال جولائی ۶۶۰ء میں امیر معاویہ کی خلافت کا فیصلہ بیت المقدس میں کر دیا گیا۔ اس کے نصف سال بعد ۲۴ جنوری ۶۶۱ء کو حضرت علی ایک قاتل کے خنجر کا شکار ہوئے۔ اس واقعہ سے امیر معاویہ کا راستہ صاف ہو گیا اور انکی فتح مکمل ہو گئی۔ کیونکہ حضرت علی کے بیٹے اور جانشین حضرت امام حسن کو وظیفہ پر الگ کر دیا گیا۔ اس طرح بنی امیہ کی خلافت شروع ہوئی، اور دمشق دارالخلافہ قرار پایا

اس خلافت اموی کو بجا طور پر عربی حکومت کہا جاتا ہے، کیوں کہ وہ قومی بنیادوں پر قائم ہوئی تھی اس لحاظ سے وہ عباسی خلافت کی بالکل ضد تھی، جس کا دعوٰے تھا کہ وہ اسلامی بنیادوں پر قائم ہے۔ خلفاء راشدہ نے خلافت کو حکومت الٰہیہ بنایا تھا۔ لیکن چونکہ اس کے رہنے والے زیادہ تر عرب تھے اس لئے اسی وقت اس نے عربی قومی حکومت کی شکل اختیار کرنی شروع کر دی تھی۔ بہت جلد عربوں کے نقل مکان کی تحریک مذہب پر بالکلیہ غالب آگئی۔ یہ واقعہ اس طرح اور بھی واضح ہو جاتا ہے کہ آئندہ پرہیزگار اور دیندار صحابہ کی جگہ شام اور عراق کے عرب قبائل نے لی، اور وہی حکومت کے عہدوں کے قابل سمجھے گئے لیکن عربوں کی اس زبردست توسیع میں مذہب کو بڑا درجہ حاصل ہے اور نئی حکومت میں مذہب ایک قابل لحاظ عنصر ثابت ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تھا کہ حکومت کے مخالفین کے ہاتھ میں بھی مذہب ایک حربہ بن گیا۔ جب کبھی ان لوگوں نے حکومت کی مخالفت کی تو مذہب ہی کو اپنا اصل اصول قرار دیکر اسی کی آڑ میں فساد و انتشار پھیلایا۔ اس امر کو واضح کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم بنی امیہ کے اندرونی حالات اور مسائل پر غور کریں۔ یہ مسائل دو قسم کے تھے۔ اول تو یہ ضروری تھا کہ حکمراں جماعت یعنے عربوں کو سیاسی مسائل زبردستی سکھائے جائیں، جن کے بغیر معاشری زندگی ناممکن تھی۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ غیر عرب مفتوحہ اقوام کے ساتھ حکمراں جماعت کے تعلقات کو باضابطہ بنایا جائے۔

سیاسی اقتدار کے لئے جو کشمکش عراق میں حضرت علی کے عہد سے شروع ہوئی تھی وہ دراصل شام کی حکومت کے خلاف تھی اور مجموعی طور پر خاندان بنی امیہ کے اکثر بڑے بڑے خلفاء کی زندگی اسی ہیر پھیر میں گذری۔ امیر معاویہ میں قدیم عرب حکمرانوں کی اکثر و بیشتر خصوصیات پائی جاتی تھیں۔ شام میں لوگ غسانیوں کے زمانے سے اس قسم کے حالات سے آشنا ہو چکے تھے، اور اسی وجہ سے شامی عربوں کی وہ تنظیم قائم ہوئی تھی جس نے انکی تہذیب و تمدن کو اس قدر بلند کر دیا تھا۔ امیر معاویہ نہایت عمدہ حکمراں تھے، اور قبائل کی مدد اور تائید سے حکومت کرتے تھے۔ یہ مدد اور تائید بالکل ایسی ہی تھی جیسے کہ ایک عمارت کی مختلف محرابیں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر تمام عمارت کو مستحکم کرتی ہیں۔ یہی حالت امیر معاویہ اور مختلف عرب قبائل کی تھی۔ اُن کی حکومت اس حد تک بزرگ خاندان کی سی تھی ان کے مشیروں کو

ہر طرح کی بات کہہ دینے کی اتنی زیادہ اجازت تھی کہ ہم ان کی حکومت کو ایک دستوری حکومت کہہ سکتے ہیں۔ لیکن امیر معاویہ کا مقصد اپنی حکومت مستحکم کرنا تھا۔ اس وجہ سے وہ بعد کے آنے والے خلفاء کی مطلق العنانی سے ہمیشہ احتراز کرتے رہے۔ حضرت عثمان کی سی خاندان پرستی سے انہیں دور کا لگاؤ بھی نہیں تھا۔ یہ بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے رشتہ داروں کی پرواہ نہ کرتے ہوں، یا ان سے بری طرح پیش آتے ہوں۔ لیکن انہوں نے خاندان کو سیاسیات پر کبھی ترجیح نہیں دی، بلکہ دونوں کو بالکل الگ الگ سمجھا۔ وہ بے انتہا مردم شناس تھے ہر کام اور مقصد کے لئے مناسب اور موزوں شخص کا انتخاب کر سکتے تھے، اور ہر شخص کو اپنا مددگار اور دوست بنا سکتے تھے۔ جن اصولوں کے تحت وہ خود شام (دمشق) میں حکومت کر رہے تھے انہیں اصولوں پر ثقفی زیاد بن ابیہ، جسے انہوں نے اپنا بھائی تسلیم کیا تھا، تقریباً ایک نیم خود مختار حاکم کی حیثیت سے سلطنت کے مشرقی صوبوں پر حکمراں تھا۔ امیر معاویہ کی سیاسی جد و جہد کا آخری مقصد یہ تھا کہ وہ ایک حکمران خاندان قائم کر جائیں اس غرض سے انہوں نے اپنے بیٹے یزید کی جانشینی کا اعلان کیا، حالانکہ عرب کے قدیم رواجی قانون، اور خود اسلامی حکومت الٰہیہ کی بہبودی کے یہ بالکل خلاف تھا۔

۱۸ اپریل ۶۸۰ء کو امیر معاویہ کا انتقال ہوا، اور یزید مغربی علاقوں اور عراق کے بعض حصوں میں خلیفہ تسلیم کر لیا گیا۔ لیکن اسے فوراً ہی دوہری مخالفت سے سابقہ پڑا۔ اول تو اہل عراق، جنہوں نے خود امیر معاویہ کے زمانے میں ہی ہل چل مچا رکھی تھی۔ بنو علیؓ کے طرف دار تھے، اور دوسرے حجاز تھا، جہاں کے لوگ اب تک حکومت الٰہیہ کے گرویدہ تھے۔ دونوں تحریکیں دراصل یہ تھیں کہ مرکزی حکومت عراق یا حجاز میں منتقل ہو جائے۔ عراق میں یہ تحریک زیادہ واضح طور پر رونما ہوئی، کیوں کہ کوفہ اور بصرہ سے سربرآوردہ خاندان اب تک نہیں بھولے تھے کہ چند سال قبل ہی حضرت علیؓ کے عہد میں وہ تمام سلطنت کے حکمران تھے۔ اس کے علاوہ شیعان علیؓ کو شامی حکومت نے ابھی زیر کیا تھا، اور حضرت علیؓ کے ساتھ انکی ہمدردی بدستور باقی تھی۔ وہ اس زرین عہد کو جو کوفہ میں کچھ عرصہ قبل گذر چکا تھا، واپس لانے کے بے انتہا خواہشمند تھے، اور وہ ان دونوں، یعنی حضرت علیؓ اور زرین عہد کو لازم و ملزوم سمجھتے تھے۔ وہ اس لئے حضرت علیؓ اور ان کے خاندان کو سراہتے اور بڑھاتے تھے کہ وہ خاص طور پر عراق کے خلیفہ تھے،

یہی کھوئی ہوئی شان و شوکت وہ اپنے ملک میں دوبارہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے حضرت معاویہ کے بعد حضرت علی کے دوسرے صاحبزادے حضرت امام حسین کو خلافت کے لئے منتخب کیا تھا۔ امام حسین اہل کوفہ کے اصرار پر رضامند بھی ہو گئے۔ آخری وقت اہل کوفہ نے انہیں دغا دے کر اپنی جبلی ناقابل اعتمادی اور بدتنظیمی کا ثبوت دیا۔ اس اثنا میں کوفہ میں یزید کا اقتدار بدستور قائم رہا۔ ۱۰ اکتوبر سنہ ۶۸۰ء کو حضرت امام حسین مع اپنے وفادار ہمراہیوں کے کربلا میں شہید ہوئے۔ رفتہ رفتہ اس سیاسی کشمکش نے مذہبی رنگ اختیار کر لیا۔ اہل کوفہ کے اصرار پر حضرت امام حسین کی تشریف آوری اور آپ کی شہادت ایک حسرتناک واقعہ تھا۔ کیونکہ اس کی وجہ سے اہل عراق اب بالکل مایوس ہو گئے، شامیوں سے ان کی نفرت حد کو پہنچ گئی۔ اور سب سے بڑھ کر بات یہ ہوئی کہ خلاف مذہب روایات کا ایک سیلاب شروع ہوا۔ ان سب اسباب نے مل کر ان تیاریوں کا آغاز کیا جو چند سال بعد مختار کی ماتحتی میں ایک زبردست شیعی بغاوت کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اب حضرت علی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے محض ایک صحابی اور داماد ہی نہیں رہے بلکہ یہ سمجھا گیا کہ وہ پیغمبر کے حقیقی جانشین تھے اور یہ جانشینی ان کی اولاد میں یکے بعد دیگرے منتقل ہوتی رہی۔ وہ لوگ جو قانون وراثت کے قائل تھے، تو علی کو حقیقی امام اور خلیفۂ بلافصل سمجھنے لگے۔ اہل بیت یا بنی ہاشم کے لئے جد و جہد اور جنگ فریق مخالف کا مطمح نظر قرار پایا۔ جب یہ فریق عراق میں سیاسی مخالفت سے دوچار ہوا تو اُس نے ایران کو اپنا دائرۂ عمل قرار دیا، اور وہاں منتقل ہو گیا۔ لیکن ایران پہنچ کر عربی قانون وراثت ایرانی تخیلات میں ضم ہو گیا، اور بنی ہاشم کے لئے جنگ میں اب عرب اور عجم ایک دوسرے کے مقابل بن کر میدان میں اترے۔ اسی نعرۂ جنگ کے تحت بالآخر بنو عباس کو فتح و ظفر نصیب ہوئی۔

کربلا کی طرف حضرت امام حسین کا کوچ ابھی ناکامی اور نامرادی پر ختم ہوا ہی تھی کہ مدینہ کی مخالف جماعت نے زور پکڑا۔ یہ جماعت شامی خاندان یعنی بنی امیہ کے مقابلے میں پرانی عالم گیر حکومت الٰہیہ کے قیام کی آرزومند تھی۔ انہوں نے خلافت کے لئے عبداللہ کو منتخب کیا۔ جو ان زبیر کے بیٹے ہیں جو جنگ جمل کے موقع پر حضرت علی کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہوئے تھے، یزید کو مجبوراً مدینہ کے خلاف ایک فوجی مہم بھیجنی پڑی۔ اور اس مہم کی وجہ سے وہ ہمیشہ مسلمانوں میں ملزم سمجھا گیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ کام اتنا شرمناک نہیں تھا

جتنا کہ سمجھا گیا ہے، اور سیاسی لحاظ سے تو اس کی ضرورت میں شبہ ہی نہیں ہو سکتا۔ یزید کے سپہ سالار نے واقعہ حرّہ میں اہل مدینہ کی مزاحمت کا بالکل خاتمہ کر دیا (۲۶ اگست ۶۸۳ء)۔ اس کے بعد اس نے حضرت عبداللہ بن زبیر کا مکہ میں محاصرہ کیا، لیکن اس دوران میں ۱۱ نومبر ۶۸۳ء کو یزید کا انتقال ہو گیا۔ اب عجیب و غریب حالات پیدا ہوئے۔ اس وقت مناسب مشورہ کی ضرورت تھی۔ حضرت عبداللہ بن زبیر کو اپنی زندگی میں اس بات کا بہترین موقع حاصل ہوا تھا کہ وہ اپنے آپ کو تمام مسلمانوں کا خلیفہ تسلیم کرا لیں۔ کیونکہ یزید بن معاویہ کا نوجوان اور بے بس جانشین معاویہ بن یزید اپنے باپ کی موت کے چند ماہ بعد ہی مر گیا تھا۔ اس کے علاوہ خود شام میں اختلافات کا دائرہ وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں کلب تھے۔ جو مدتوں قبل شام کو اپنا وطن بنا چکے تھے۔ انہوں نے امیر معاویہ کے ساتھ مصاہرت کے تعلقات قائم کئے تھے۔ اور غیر مشروط طور پر بنی امیہ کے فریق میں شریک ہو گئے تھے۔ بلا اختلاف رائے کلب چاہتے تھے کہ بنی امیہ کی حکومت باقی رہے اور اس طرح شام میں خود ان کا تفوق برقرار رہے۔ ان کے لئے فیصلہ طلب مسئلہ صرف یہ تھا کہ بنی امیہ کی کون سی شاخ حکمراں بنائی جائے عملی ضروریات اور روایتی تخیلات کی بناء پر بنی امیہ کے فریق نے اس پر اتفاق کیا کہ معاویہ بن یزید کے کم عمر جانشین کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اور تقدم و افضلیت کے قواعد کے مطابق مروان بن الحکم کو ترجیح دی جائے جو حضرت عثمان کے زمانے میں با اقتدار رہ چکا تھا۔ چنانچہ مروان خلیفہ منتخب کر لیا گیا۔ فریق مخالف قیس تھے یہ اپنی روایات کے مطابق حضرت عبداللہ بن زبیر کے حامی تھے۔ دونوں فریقوں، یعنے کلب و قیس میں ایک فیصلہ کن جنگ آغاز ۶۸۴ء میں مرج راہط کے مقام پر ہوئی۔ بنی امیہ کو فتح ہوئی اور شام میں مروان کی خلافت کا اعلان کر دیا گیا۔

بنی امیہ کو یہ فتح بہت گراں پڑی کیونکہ اس نے عربی حکومت کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیا۔ مرج راہط کے واقعہ سے جو نفرت دلوں میں بیٹھی اور وہ قبائلی عناد اور خونی دشمنی جو اسکی وجہ سے پیدا ہوئی اس قدر زبردست تھی کہ مذہب بھی اسے ختم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس سے قبل بھی عرب بے شمار چھوٹے چھوٹے گروہوں میں منقسم تھے۔ لیکن مرج راہط سے اس انتشار میں اور بھی ترقی ہوئی اور قیس و

کلب میں قبائلی عناد مستقل اور مستحکم ہو گیا یہاں تک کہ پرانی دشمنیاں بھی اس کے سامنے ہیچ ہو گئیں، اور سب نے مل جل کر اس نئے عناد میں اور بھی زیادہ تیزی اور تلخی پیدا کر دی۔ قیس خلافت کے تمام حصوں میں پھیلے ہوئے تھے اور ان کے تمام دشمن بنی کلب کی زیر حمایت آ گئے۔ اس طرح سیاسی فریق بندی اور عرب کے قدیم نسبی اور نسلی نظریات کے مل جانے سے نئے سیاسی حالات پیدا ہوئے۔ ایک مختصر سے زمانہ میں شمالی اور جنوبی قبائل کی دشمنی ہر سمت پھیل گئی، اور جھگڑے شروع ہو گئے۔ "یا قیس" اور "یا کلب" کے نعرہ ہائے جنگ کے تحت دونوں قبائل نے ایک دوسرے کے ٹکڑے اڑانے شروع کئے، یہ نعرے سلطنت کے ہر گوشہ میں گونجنے لگے۔ ابتداً یہ خالص قبائلی اور خانگی جھگڑے تھے، جن میں سیاسیات اور قبائلی خصوصیات ہی کو دخل تھا۔ رفتہ رفتہ انہوں نے خلافت کی سیاسی مخالفت کی شکل اختیار کی اس سے تمام سلطنت کی بنیادیں ہل گئیں۔ حاکمان صوبہ بھی آخر عرب تھے۔ وہ بھی ان جھگڑوں میں بہت دنوں تک غیر جانب دارانہ رہ سکے۔ آخر نوبت یہاں تک پہونچی کہ خلفاء بھی ان فسادوں میں طرف دارانہ حصہ لینے لگے۔ سب سے بڑا غضب یہ ہوا کہ خلافت امویہ کے انتہائی عروج کے زمانے میں یہ ابتری ظاہر ہوئی۔

مروان نے اپنی خلافت کے اعلان کے بہت جلد بعد مصر فتح کر لیا، اور پھر اس کا انتقال ہو گیا اس کا بیٹا عبدالملک (۶۸۵ء سے ۷۰۵ء) اس کا جانشین ہوا، اور تمام مشکلات کا وارث بنا۔ سب سے پہلے تو اسے بازنطینیوں سے سابقہ پڑا جنہوں نے عمان کے مفسد کوہستانی باشندوں کو اس کے خلاف اکسایا۔ اس لئے خلافت کے ابتدائی عہد میں عبدالملک عراق کی اندرونی جدوجہد میں کوئی حصہ نہ لے سکا۔ یہاں کم از کم بظاہر زبیریوں کی حکومت تھی۔ حضرت عبداللہ بن زبیر کے بھائی مصعب وہاں ان کے نمائندہ تھے۔ اس کے علاوہ شیعہ نے وہاں پھر سر اٹھایا، اور مختار کی ماتحتی میں ایک زبردست شورش برپا کی۔ عبدالملک کی ایک فوج کو انہوں نے شکست دی تھی لیکن مصعب کے مقابلے میں شیعہ بھی تباہ ہو گئے۔ دوسری طرف خارجیوں کی وجہ سے مصعب بھی عبدالملک اور شامیوں کے خلاف کوئی جارحانہ اقدام نہیں کر سکتے تھے۔ خارجی ہر طرح کی حکومت کے خلاف برسرپیکار تھے۔ اور حقیقی معنوں میں ملک کے لئے ایک بلائے بے درماں بنے ہوئے تھے۔ لیکن آخر کار دریائے دجلہ کے کنارے ۶۹۱ء میں

عبدالملک کے خلاف ایک فیصلہ کن جنگ میں مصعب نے شکست کھائی، اور شامی خلیفہ کا سیاسی اور فوجی تفوق قائم ہو گیا۔ ابھی حجاز میں حضرت عبداللہ بن زبیر باقی تھے۔ ان کے خلاف عبدالملک نے اپنے بہترین ملازم حجاج بن یوسف کو بھیجا، جس نے ۶۹۲ء میں زبیریوں کی خلافت اور عبداللہ بن زبیر کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

یہ حجاج بن یوسف بعد میں عبدالملک کا زیاد بن ابیہ ثابت ہوا۔ وہ بلا شرکت غیرے خلافت کے تمام مشرقی صوبوں پر حکمراں تھا اور اس نے کوشش کی کہ ان صوبوں میں خلافت کی طاقت کو سختی کے ساتھ مستحکم کر کے عراق کی گذشتہ مفسدانہ روایات کو ختم کرے۔ اسی وجہ سے عراقی مورخوں نے اُسے بدنام کرنے کی انتہائی کوشش کی ہے اور اسکی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ مسلمان آج تک اس کے نام سے متنفر ہیں۔ حجاج کی بھی زیاد کی طرح ثقفی تھا۔ اس نے عراق میں وہی کام انجام دیا جو خود عبدالملک شام میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا یعنی دونوں نے سلطنت میں استحکام اور اتحاد پیدا کرنا چاہا۔ روایات کے مطابق اسلامی حکومت کی بنیاد حضرت عمر نے ڈالی تھی لیکن روایات نے حضرت عمر کو جس حد تک اس کا ذمہ دار ٹھیرایا ہے وہ ناممکن ہے آپ کی خلافت کا زمانہ صرف دس برس کا ہے جس میں نہایت ہی زبردست فوجی مہمیں جاری رہیں، بلکہ درحقیقت یہ عہد انہیں مہموں سے بھرا ہوا ہے حضرت عمر کو حکومت کے اداروں کی طرف توجہ کرنے کا نہ وقت ملا اور نہ موقعہ۔ اسی وجہ سے عہد حاضر کے محقق اُسے امیر معاویہ کا کارنامہ سمجھتے ہیں۔ مگر غالباً اس کارنامے میں حضرت عمر، امیر معاویہ، عبدالملک اور شائد ہشام بن عبدالملک برابر کے شریک ہیں۔ حضرت عمر نے محاصل ادا کرنے والے مفتوحین پر عربوں کا تفوق قائم کیا انہوں نے سلطنت کا مالی انتظام باقاعدہ کر کے اس تفوق کو اور مستحکم کر دیا۔ امیر معاویہ نے عربی حکومت کو خاندانی اور موروثی بنیادوں پر قائم کیا، قبائل میں ضبط و تنظیم پیدا کی، اور مذہب کی حکومت کو سیاسی رنگ دیا۔ لیکن عبدالملک نے سب سے پہلے عملی طور پر خالص عربی نظم و نسق کی بنیاد رکھی، ہشام بن عبدالملک نے ایک قدم اور آگے بڑھایا، اور جس طرح عباسیوں نے اپنے زمانہ میں عربوں کے سیاسی تفوق کو بالکل ختم کر دیا تھا، اسی طرح ہشام نے معاشی زندگی میں عربوں کے مخصوص اختیارات

اور امتیازات کا خاتمہ کر دیا۔

عرب اتنے بے وقوف نہیں تھے جتنے کہ آج کل کے اکثر فاتح ہوتے ہیں، جو مفتوحہ ملک کے پورے نظم و نسق کو بالکل مٹا کر ایک نیا نظم و نسق قائم کر دیتے ہیں اور پھر طرح طرح کی مشکلات میں پھنس جاتے ہیں جن سے عہدہ برا ہونا مشکل ہوتا ہے۔ عربوں نے اپنے سیاسی نظام کے تخیلات کو قدیم نظم و نسق کے مطابق بنایا، اور صرف اسی پر اکتفا کی کہ مقامی حاکم مقررہ محاصل بروقت وصول کرتے رہیں۔ اور اس کی ذرا بھی پرواہ نہیں کی کہ یہ محاصل کس طرح وصول ہوتے ہیں۔ نظم و نسق کے صرف اعلیٰ عہدوں پر عرب مقرر تھے۔ وسطی اور ادنےٰ درجہ کی تمام ملازمتیں آٹھویں صدی، بلکہ حقیقت میں اس کے بعد تک مقامی باشندوں کے ہاتھ میں رہی۔ عبدالملک اور اس کے جانشین ولید کے زمانے میں سب سے پہلی مرتبہ نظم و نسق کے پیچیدہ کام میں مرکزی حکومت نے دخل دیا، اور پھر بھی اسے مکمل طور پر خالص عربی نہ بنایا جا سکا۔ عربی زبان کو دفتری زبان بنا کر عربوں کو صرف ایک سہارا دیدیا۔ اس کے باوجود تمام کاروبار دونوں زبانوں میں ہوتا رہا۔ چنانچہ اس زمانے کے عربی۔ یونانی کاغذات کی ایک بڑی تعداد مصر میں دستیاب ہوئی ہے جس سے ہمارے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ باقی اور لحاظ سے ان کی حکومت میں عوام اپنے پرانے طریقوں پر جس سے وہ مدتوں سے مانوس تھے چلتے رہے! اور وہی پرانے دستور برابر جاری رہے۔ اسی طرح عبدالملک نے عربی سکے کی بھی تنظیم کی اور وہی اس تنظیم کا بانی تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اس نے اپنے سکہ کو اسی اصول کے مطابق بنایا جو پہلے سے رائج تھا۔ اس نے قدیم بازنطینی اور ایرانی علاقوں میں وہیں کے سونے اور چاندی کے سکے ترمیم کے بعد رائج کئے۔ لیکن سب سے زیادہ اہم بات مجھے یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کے زمانے میں لوگوں کا احساس ہوا کہ حضرت عمر کا قائم کردہ مالی نظام اب مرور زمانہ کی وجہ سے ناقابل عمل ہو گیا ہے اور اصولاً اور عملاً وہ اب خاتمہ پر ہے۔ اس وقت تک مسلمان محاصل سے آزاد تھے اور مفتوحہ اقوام تمام رقم ادا کیا کرتی تھیں۔ شروع میں یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ جب اسلام عام طور پر پھیل جائے گا تو محاصل ادا کرنے والوں کی تعداد خود بخود کم ہوتی جائے گی اور اس طرح مذہب کے پھیلنے سے عرب سلطنت کی مالی بنیاد کمزور ہوتی جائے گی

عربوں کی فوجی چھاؤنیاں رفتہ رفتہ بڑے بڑے شہر بن گئی تھیں۔ اس کی وجہ سے اہل زراعت کے لئے زمینیں بہت زیادہ قیمتی ہو گئی تھیں۔ انہیں زمینوں سے وہ لوگ اپنے اپنے علاقوں کی رقم حاصل کرتے تھے۔ اب ایک نئی تحریک شروع ہوئی کہ جس قدر زیادہ تعداد میں ہو سکے عرب زراعت کریں۔ اسی طرح ایک طرف تو پرانے کاشتکار بے دخل ہوئے اور دوسری طرف بے شمار لوگ مسلمان ہونے لگے۔ چونکہ نو مسلم خراج سے آزاد ہو جاتے تھے اس لئے ہم خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان دونوں تحریکوں کے نتائج مالیات کے لئے کیا کچھ نہ ہوئے ہوں گے۔ اسی سے یہ احساس ہوا کہ حضرت عمر نے حکومت کو جو شکل دی تھی وہ اب قابل عمل نہیں رہی۔ زمین کی زبردست مانگ کے مقابلے میں یہ ضروری تھا کہ ان اراضی کی تشخیص کر دی جائے جن پر لگان ادا کرنا لازمی تھا۔ ان حالات میں عرب مجبور ہوئے کہ وہ نظم و نسق کی تفصیلات میں دخل دیں اور انہیں اس تمام سلسلہ کو سمجھنا پڑا۔ یہ عمل خلیفہ عبد الملک کے عہد سے شروع ہوا۔ اس کے حاکم عراق حجاج بن یوسف نے انتہائی کوشش کی کہ مالیات پر جو برے اثرات مرتب ہونے والے ہیں ان سے اپنے صوبہ کو محفوظ رکھے، اور اسی وجہ سے اس نے حضرت عمر کے نظام حکومت کے خلاف نو مسلموں پر بھی خراج کی ادائی لازمی قرار دی۔

ایک طرف تو مفتوحین کے اسلام لانے سے مالیات پر اثر پڑ رہا تھا اور دوسری طرف اتنا ہی برا اثر اس سے مرتب ہوا کہ عرب زرخیز مقامات پر آباد ہوتے چلے گئے۔ حالانکہ جب تک وہ غیر مسلموں کے قبضے میں تھیں ان سے لگان وصول کیا جاتا تھا اس تحریک کو روکنے کی کوشش حضرت عمر بن عبد العزیز نے کی اور اس قسم کے زمینوں کی خرید و فروخت ممنوع قرار دی۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ، خصوصاً خلیفہ ہشام کے زمانے میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ پرانی روایات ترک کر کے نئے اصول قائم کئے جائیں، خراج جس کا بڑا حصہ زمینوں سے وصول ہوتا تھا اسے خالص لگان قرار دیا گیا اور باقی جائداد غیر منقولہ سے الگ ایک رقم بطور محصول وصول کی جانے لگی۔ عرب حکومت نے پرانے جزیہ کو پھر نئے سرے سے تازہ کیا۔ یہ محصول صرف غیر مسلم ادا کرتے تھے، اور مسلمان ہو جانے پر اس محصول سے آزاد ہو جاتے تھے۔ روایات کے مطابق اس محصول کے عاید کرنے والے بھی حضرت عمر ہی بتائے جاتے ہیں لیکن اگر غور کیا جائے اور تمام تبدیلیوں کو خیال میں رکھا جائے

تو معلوم ہوگا کہ یہ محصول سو برس سے زیادہ کے ارتقاء کا نتیجہ تھا۔ عربوں کا نظم و نسق کے معاملہ میں دخیل ہونا عبدالملک کے زمانہ میں شروع ہوا اور عباسیوں کے عہد میں ختم ہوا۔

عبدالملک کے عہد میں مصر اور عراق میں، جہاں اس کا بھائی عبدالعزیز اور حجاج بن یوسف حاکم تھے، متعدد زبردست شورشیں ہوئیں۔ شروع میں معلوم ہوتا تھا کہ خلافت پر تباہی آجائے گی لیکن ان کے فرو ہونے پر حکومت کا زور برابر بڑھتا چلا گیا۔ اور امن وامان کبھی سخت خطرے میں نہیں پڑا۔ بہرحال اب مکمل امن قائم ہوچکا تھا۔ عبدالملک کے بیٹے اور جانشین ولید (۷۰۵ء سے ۷۱۵ء) کو دوبارہ سلطنت کی سرحدیں وسیع کرنے کا موقع ملا۔ اس کے زمانے سے عرب حکومت کی بے انتہا توسیع ہوئی۔ اندلس فتح ہوا، جس کا ہم آئندہ ذکر کرینگے اور پنجاب اور وسط ایشیا میں چین کی سرحد تک عرب پہنچ گئے لیکن ان مہموں کی تفصیل ہمارے موضوع سے باہر ہے۔ عبدالملک اور ولید کے عہد میں تمام سلطنت بالخصوص شام، انتہائی شان و شوکت پر پہنچ گئی۔ بیت المقدس میں مسجد عمر اور دمشق میں مسجد اموی جیسی عظیم الشان عمارتیں ہوئیں۔ دمشق کا پرشکوہ دربار شعر و شاعری کا مرکز بنا اور پہلی مرتبہ مسلمانوں پر یونانی علوم کا اثر پڑنا شروع ہوا۔ اس سے مسلمانوں کی علمی ترقی کا آغاز ہوا۔

لیکن تنزل و انحطاط کے اسباب بھی ظاہر ہونے لگے۔ حجاج نے سخت تکلیفیں اٹھا کر عراق پر فوجی قبضہ قائم رکھا تھا اور پھر بھی حکومت کا تفوق صرف شامی فوجوں کی مدد سے برقرار رکھا جاسکا تھا۔ مشرقی صوبوں میں قیس اور کلب آپس میں برسرپیکار تھے چنانچہ بنی امیہ کے آخری دور میں مشرقی جنگیں برابر جاری رہیں اور اس عہد کی خصوصیات میں داخل ہیں۔ اس عہد میں خلفاء کا عہد حکومت بہت ہی مختصر رہا۔ سلیمان نے ۷۱۵ء سے ۷۱۷ء تک عمر بن عبدالعزیز نے ۷۱۷ء سے ۷۲۰ء تک یزید بن ولید نے ۷۲۴ء تک حکومت کی صرف ہشام کا عہد خلافت ۷۲۴ء سے ۷۴۳ء تک رہا۔ اس خلیفہ نے اراضی کا مسئلہ ہاتھ میں لیا، اور اسے زیاد بن ابیہ اور حجاج بن یوسف جیسا ایک حاکم عراق، خالد بن عبداللہ القسری بھی مل گیا اور یہ ممکن ہوا کہ ایک مرتبہ پھر تھوڑی مدت کے لئے امن قائم کردیا جائے۔

لیکن ہشام کے بعد خلافت اموی کا انحطاط بہت سرعت کے ساتھ ہوا۔ قیس اور کلب کی سیاسی رقابت نے خلفاء کو اس قبائلی عناد اور خانہ جنگی میں کٹھ پتلی بنا دیا۔ بنی امیہ بنی امیہ کے خلاف لڑنے لگے۔ خلفاء یکے بعد دیگرے جلدی جلدی بدلے گئے۔ ۷۴۳ء سے ۷۴۴ء تک چار خلیفہ ہوئے۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا اس ال جل کو ختم کرنا اور بھی ناممکن ہوتا گیا۔ ۷۴۴ء میں بنی امیہ کا آخری خلیفہ مروان جعدی خلیفہ ہوا۔ یہ شخص نااہل نہیں تھا۔ لیکن اس وقت بنی امیہ بازی ہار چکے تھے۔ فرقہ بندی انجام کار کامیاب ہوئی۔ ہر شخص دوسرے سے برسرپیکار تھا۔ لیکن درحقیقت تمام جنگ بنی امیہ اور شام کے خلاف تھی۔ اس مخالفت میں ایک دوسرا اتحاد کام کر رہا تھا جس کی بنیاد دور افتادہ خراسان میں پڑی تھی۔

سلطنت کے کسی حصے میں مفتوحین کے ساتھ عرب ایسے گھلے ملے نہیں تھے جیسے کہ خراسان میں، اور یہیں بنی امیہ کے خلاف مذہبی تحریک اس قدر سختی سے شروع ہوئی جس کی مثال دوسرے علاقوں میں نہیں ملتی۔ بہت جلد یہ معلوم ہوا کہ شیعوں نے ایران کی سرزمین میں بے انتہا پیرو پیدا کرلئے ہیں۔ "اہل بیت کے لئے جنگ" کے بہانے سے عباسیہ نے سپہ سالار ابومسلم خراسانی کی مدد سے فتح حاصل کی اور عجمی عناصر نے پہلے مشرقی عربوں کے خلاف اور پھر شامیوں کے خلاف انہیں مدد دی۔ آخر ۷۵۰ء میں خلافت اموی ختم ہوگئی۔

عباسیوں کی کامیابی درحقیقت عربوں کے مقابلے میں ایرانیوں کی فتح تھی۔ آخر مفتوحین کی جماعت عربوں کے خلاف سر اٹھانے کے قابل ہوئی تھی۔ شروع میں جب عیسائیوں اور ایرانیوں نے اسلام قبول کیا تو یہ ممکن نہ تھا کہ حکومت الٰہیہ میں انہیں جگہ دیجائے۔ اس لئے ان لوگوں کو کسی کسی عرب قبیلے سے وابستہ کرکے انہیں موالی کہا جانے لگا۔ یہ لوگ عرب کے مقابلے میں زیادہ متمدن اور مہذب واقع ہوئے تھے اور اکثر موقعوں پر عربوں کے پہلو بہ پہلو لڑے بھی تھے۔ عربوں اور موالی میں جو مخاصمت پیدا ہوئی تھی اسکی اصلی اور حقیقی وجہ حضرت عمر کے قائم کردہ اصول تھے۔ موالی نے رفتہ رفتہ نام پیدا کرنا شروع کیا اور عرب قبائل کے مقابلے میں ہر جگہ زیادہ کامیاب رہے۔ اسی کیساتھ

دونوں فریقوں کی مخالفت بڑھتی گئی۔ اور موالی اسلامی اصول کی پابندی اور پابجائی پر زور دینے لگے۔ دوسری طرف یہ حالت تھی کہ عرب خود اپنی حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھاتے تھے اور پھر خانہ جنگی کے سیاسی اور نسلی مفروضات میں رخنے پڑنے شروع ہو گئے تھے۔ اس وجہ سے اس خیال کو اور بھی تقویت ہوئی کہ عربوں کو اسلام میں کوئی خاص الخاص حقوق حاصل نہیں۔ رفتہ رفتہ حقیقی مساوات کی ایک زبردست تحریک شروع ہوئی اور یہ احساس پیدا ہوا کہ عرب اور غیر عرب میں درحقیقت کوئی فرق نہیں۔ دونوں قوموں نے اسلام کے اصولوں کو مستحکم طور پر اختیار کیا اور بجائے عرب اور غیر عرب کہلانے کے اپنے آپ کو مسلمان کہنے لگے۔ چنانچہ آجتک مسلم اقوام میں قومیت کی یہی نشانی ہے۔ عربوں کے مقابلے میں عجمی زیادہ دین پرست واقع ہوئے تھے اور انہوں نے شیعی حزب مخالف کے مذہبی رنگ کو عملی طور پر بلا پس وپیش اختیار کر لیا تھا۔ اسی مذہبی تحریک نے بالآخر بنی امیہ کو تباہ کیا اس طرح بنی امیہ کی خالص عربی حکومت کی جگہ اب عباسیوں کی بین الاقوامی حکومت قائم ہوئی۔ عرب امراء و عمائد غائب ہو گئے اور انکی جگہ مخلوط الاقوام امراء کی جماعت نے لی جن کی بنیاد نہ تو مذہب پر تھی اور نہ نسل پر بلکہ ان کی عزت و تکریم کا دار و مدار حکمران کی ذات پر تھا۔ اسی طرح بنی امیہ کی قدیم عربی بادشاہت کی جگہ عباسیوں کی مطلق العنان حکومت قائم ہوئی اور ان کے ساتھ عجمی تہذیب اور اسلامی تہذیب دونوں مل جل گئیں۔ مختصر یہ ہے کہ قدیم ایشیا نے ایشیا پر غالب آیا۔ فقط

(باقی)

بیداری پیدا ہوئی ہے اور اس سے تمام مغربی ممالک اور امریکہ زچ آگیا ہے اور آسانی سے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اگر اس قسم کی ترقی چین اور ہندوستان میں ہو جائے جس کے آثار آہستہ آہستہ ہویدا ہو رہے ہیں تو پھر مغرب کا خدا حافظ ہے۔

آبادی اور قومی آمدنی

آبادی اور قومی آمدنی میں بہت قریبی تعلق ہے۔ اگر آمدنی بڑھ جائے تو پھر زیادہ آبادی بھی آرام سے زندگی بسر کر سکتی ہے۔ مغربی ممالک میں گذشتہ صدی میں ایسا ہی ہوا لیکن ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ بڑھتی ہوئی آمدنی کیا مغربی اقوام کے اعلیٰ اوصاف اعلیٰ کارکردگی اور اعلیٰ صلاحیتوں کا نتیجہ ہے یا محض اتفاقی چیز ہے جو یا تو قدرتی طور پر ہاتھ لگ گئی ہے جیسے کہ نوآبادیات کی ترقی۔ یہ ترقی قدرتی فوائد ختم ہونے کے بعد خود ختم ہو جائے گی یا یہ ترقی سیاسی قوت کے بل بوتے پر ہوتی ہے جو سیاسی اقتدار کے تنزل کے ساتھ خود بخود روبہ انحطاط ہو جائے گی۔

اس مسئلہ پر یہاں زیادہ تفصیلی روشنی نہیں ڈالی جاسکتی کیونکہ یہ مسئلہ اس مضمون کی بحث سے خارج ہے آئندہ مضمون میں ہم متوازن آبادی پر بحث کریں گے جس سے پتہ چلے گا کہ محض آبادی کی کمی یا بیشی کسی ملک کی خوش حالی یا پستی کا معیار نہیں ہے بلکہ آبادی کے جانچنے کے معیار حالات اور واقعات کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔

از

پروفیسر محمد جمیل الرحمٰن صاحب ایم۔اے۔ جامعہ عثمانیہ

دوسرا حصہ

ہمارے موضوع کے مطابق اس مضمون کے دو حصے قرار دیے جاسکتے ہیں۔ پہلے حصے میں ہم نے ایشیا اور مصر میں عربوں کی توسیع کا ذکر کیا ہے، اور اب دوسرے حصے میں افریقہ اور یورپ میں ان کی ترقی کے حالات بیان کریں گے۔ یہ حصہ بیرونی لحاظ سے نہ سہی لیکن اندرونی لحاظ سے بالکل الگ ہے۔ اس وقت بھی ایشیا اور مصر کے مقابلے میں شمالی افریقہ کا اسلام بالکل جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اس فرق کی اصل وجہ اگر تلاش کرنی ہو تو ان دو حصوں کے باشندوں کے حالات اور ان کے اختلاف میں ملے گی۔ مشرق قریب کی آبادی کے ارامی عنصر اور مصر کی قبطی آبادی نے عربی قومیت اور عربی زبان کی سب سے کم مخالفت کی، اور بہت ہی جلد عربوں میں مل جل گئے۔ اس کے برعکس جیسا کہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں، وسط ایشیا میں ایرانیوں نے عربیت کی سب سے زیادہ مخالفت کی۔ ان دونوں کے بین بین بربریوں یا شمالی افریقہ کے باشندوں کا

حال رہا۔ ان لوگوں نے اسلام اور عربی تہذیب و تمدن کو قبول تو کر لیا، لیکن اپنے تمدن کے عناصر اُس میں شریک کئے، اور اپنی قومیت، عام رسم و رواج، اور ایک بڑی حد تک اپنی زبان کو محفوظ رکھا۔ اس کے علاوہ زمانۂ وسطیٰ میں ان متلون المزاج بربریوں نے یورپ میں اسلام پھیلانے کا کام انجام دیا، اور ان کے بغیر یہ کام انجام پانا تقریباً ناممکن تھا۔ پھر جنوبی یورپ کے مسلمانوں کے سیاسی تعلقات اس طرح مسلسل طور پر بعد کے زمانے میں، افریقہ سے قائم رہے کہ یورپ کی اسلامی تاریخ شمالی افریقہ کی تاریخ سے ایسی وابستہ ہوگئی کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ناممکن ہے۔ اسی اثنا میں شمالی افریقہ کے تعلقات مشرقی خلافت سے بھی رہے۔ یہ تعلقات نہ صرف مذہبی تھے، بلکہ تمدنی بھی۔

تمام مغربی اسلام پر عربوں اور بربریوں کے میل جول سے، رفتہ رفتہ عجیب و غریب اثرات پڑے، اور اُس نے ایک خاص شکل اختیار کر لی۔ سینکڑوں برس گذر گئے، لیکن اسلام اب بھی وہاں ترقی پر ہے۔ یہاں اس سے قبل فنیقی اور رومی ناکام ہو کر تباہ اور بے نام و نشان ہو چکے تھے۔ یہ دونوں زبردست اقوام درحقیقت ہمیشہ ان شہروں تک ہی محدود رہیں جو ساحل بحر پر واقع تھے، اور انھیں شہروں میں انھوں نے بلاشبہ ان بربریوں سے تعلقات قائم کئے جو وہاں جمع ہو گئے تھے، اور اپنے لئے ایک خاص قسم کا تمدن پیدا کر لیا۔ رومیوں کی استعماری جدوجہد صرف میدانی اور ساحلی علاقوں تک محدود رہی۔ اندرونی ملک میں بربری تمدن جوں کا توں جاری اور باقی رہا، جیسا کہ ایک موقع پر موسن نے کہا ہے کہ فنیقی اور رومی مدتیں ہوئیں برباد ہو کر بے نام و نشان ہو گئے، مگر بربری کھجور کے درختوں اور صحرا کے ریت کی طرح اب تک موجود ہیں۔ رومی سلطنت کی تباہی کے بعد بربری قبائل کی وسیع تنظیم پھر بروئے کار آئی، اور قیصر جسٹینین کے عہد میں جب بازنطینی ردعمل شروع ہوا، اور اس ساحل پر دوبارہ قبضہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ بربری آبادی کے زور پکڑ لینے سے اس سلطنت کی حدود اور بھی مختصر ہو گئی ہیں۔ اس صوبے کے بازنطینی حاکم ہمیشہ بربری شورشوں اور بغاوتوں کے فرو کرنے میں مشغول رہے،

اور ان شہروں کی آبادی جن پر وہ قابض تھے، برابر کم ہوتی چلی گئی۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ بازنطینیوں کو ان شہروں پر بھی قبضہ قائم رکھنا مشکل ہوگیا جہاں ان کی عظیم فوجیں موجود تھیں۔ ان حالات سے یہ پتہ چل گیا ہوگا کہ عربوں نے شمالی افریقہ کو بازنطینیوں سے فتح نہیں کیا، بلکہ بربریوں سے فتح کیا، جو اس وقت اپنے پرانے مطلق العنان حکمرانوں اور دشمنوں سے بیزار تھے، اور ان کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کر چکے تھے۔ عربوں کو بھی اس میں بڑی دقت پیش آئی کہ وہ تلوار کے ذریعہ سے بربریوں کو یہ سمجھائیں کہ ان کی حقیقی بھلائی اسلام کی مخالفت کے بجائے اسلام کی دوستی اور موافقت میں ہے۔ جب بربری ایک مرتبہ یہ سمجھ گئے تو انھوں نے عربوں کا مقابلہ کرنا ترک کردیا اور عربوں کے زیر سرکردگی یک بارگی ایک طوفان کی طرح جنوبی یورپ پر ٹوٹ پڑے۔ لیکن بربری خصوصیات کے محفوظ رہنے کے باوجود افریقہ میں اسلامی تہذیب برابر ترقی پر رہی۔

اسکندریہ کی مستقل فتح کا تقاضا یہ تھا کہ سرحدی علاقہ، یعنی برقہ کو فتح کرکے مصر کے لئے ایک سد قائم کرلی جائے۔ برقہ پنٹاپوس کا سرحدی شہر تھا۔ اس علاقہ کے دولت مند شہروں کو اسلامی فتح مصر کے نتائج فوراً اس وقت برداشت کرنے پڑے جب عرب اچانک ان کے سامنے ظاہر ہوئے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہے، عربوں کے قبضہ اسکندریہ کے بعد ہی حضرت عمرو بن عاص نے برقہ کے ساتھ عہد نامہ کیا تھا۔ یہ واقعہ ۶۴۲ء کے موسم خزاں کا ہے۔ اور اس کے بعد موسم سرما میں عقبہ بن نافع کی سرکردگی میں ایک مہم وہاں پہنچی جس کا ذکر آئندہ آئے گا۔ پنٹاپوس اس وقت سے اسلامی سلطنت کا ایک حصہ قرار پایا، گو اپنے اندرونی معاملات اور نظم ونسق کے لحاظ سے وہ بالکل خود مختار رہا۔ شمالی افریقہ کو عرب دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ برقہ کا مقام حاکم افریقہ کی سرحد تھا۔ مشرقی حصہ کو عرب طرابلس کہتے ہیں، اور اس کے نصف شمالی حصہ کو جس کا صدر مقام قرطاجنہ تھا۔ افریقہ یا صرف افریقہ کہتے ہیں۔ حضرت عمرو بن عاص کے زمانے ہی میں برقہ کی فتح کے ساتھ طرابلس کے تمام علاقے میں (۶۴۲ء۔ ۶۴۳ء) مختلف فوجیں جنوب او

ریگستان میں بھیجی گئیں تھیں۔ اس لئے اس میں ذرا شبہ نہیں کہ اُس وقت حضرت عقبہ فزّان (فزّویلہ)
تک اور ایک اور امیر بُسر نخلستان جُفرہ (وُدّان) تک پہنچے تھے۔ عمرو بن عاص کے محاصرۂ
طرابلس کے دوران میں معلوم ہوتا ہے کہ بُسر نے وَدّان پر عارضی قبضہ بھی کر لیا تھا۔ کوہستان
نفُوسہ سے عمرو بن عاص واپس ہوئے، کیونکہ خلیفہ آگے بڑھنے کے مخالف تھے۔ بہرحال اس
وقت برقہ کے مغرب میں عربوں کے مستقل قیام و استحکام کی کوئی اطلاع نہیں ملتی۔ عقبہ نے
برقہ سے چھوٹی چھوٹی مہمیں بھیجیں۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہ کر سکے، کیونکہ فوج کا بڑا حصہ
اس وقت اسکندریہ کے سامنے جمع تھا، جسے ایک بار پھر بازنطینیوں نے فتح کر لیا تھا۔

جب اسکندریہ پر مسلمانوں نے دوبارہ قبضہ کر لیا، اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح
مصر کے حاکم ہو گئے، تو ان کی سرکردگی میں ۲۷ھ کے آخر میں مغرب پر فوجکشی کے لئے ایک
زبردست نئی مہم تیار کی گئی۔ مگر وہاں حالت یہ تھی کہ بازنطینی حکومت آخری سانس لے رہی تھی۔
بطریق جرجیر (گرگوریس) ایک سال قبل قرطاجنہ میں بازنطینیوں کے خلاف باغی ہوا تھا، اور اسکندریہ
میں یونانی شکست کے بعد اسے غالباً یقین ہو گیا تھا کہ یونانی اس کے خلاف کوئی کارروائی
کرنے کے قابل نہیں رہے، اور وہ بالکل محفوظ رہے گا۔ بہرحال معلوم ہوتا ہے کہ خود قرطاجنہ
میں بھی اُسے تسلیم نہیں کیا گیا۔ اس کی حکومت کے ہمدرد اور مددگار بربری تھے۔ اسی وجہ سے
جرجیر نے قرطاجنہ کو خیرباد کہا اور اندرون ملک میں سفوتولا، موجودہ "سبطلہ" کے مقام پر
سکونت اختیار کی۔ یہاں بھی اس کو فوج پر اتنا کم اقتدار حاصل تھا کہ وہ عبداللہ بن سعد کے
خلاف لڑنے کے لئے نہ نکل سکا۔ عبداللہ کے مختلف فوجی دستوں نے طرابلس کو فتح کئے بغیر
گردونواح کے علاقے کو خوب دل کھول کر لوٹا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک عربی دستہ فوج دیکھ بھال
کی غرض سے غدامس بھی پہنچا۔ عبداللہ بن سعد وہاں آئے جہاں بعد میں قیروان آباد ہوا،
اور ایک بارگی وہ وہاں سے پھرے اور سبطلہ کی طرف چلے، جہاں اُنھوں نے جرجیر کی فوج کو
تہس نہس کر دیا۔ بطریق کا انجام صحیح طور پر معلوم نہیں، مگر غالباً وہ اس جنگ میں کام آیا تھا۔

اس جنگ کا میدان غالباً وہ مقام ہے جسے عین اُوبا (؟) کہتے ہیں۔ لیکن اس مرتبہ بھی عربی حکومت کو استحکام و استقلال نصیب نہیں ہوا۔ ناقابل تسخیر شہر اب تک باقی تھے۔ اس لئے عبداللہ نے اسے ترجیح دی کہ ایک زبردست رقم بطور خراج عائد کردیں، اور اس کی ادائی پر واپس ہوجائیں۔ اس رقم کی تعداد تین سو تالنت بیان کی جاتی ہے۔ یہ مہم سال بھر تک (۶۴۷ء۔ ۶۴۸ء) جاری رہی۔

اب وہ تنازعات اور خانہ جنگیاں شروع ہوئیں جو حضرت عثمان کی شہادت کا نتیجہ تھیں، اور توسیع سلطنت کے تمام منصوبے رُک گئے۔ لیکن جب ان جنگوں کے بعد امیر معاویہ خلیفہ ہوگئے، اور اُن کے وفادار دوست دوبارہ مصر کے حاکم ہوئے تو مغرب کی فوجی مہیں پھر شروع ہوئیں۔ عمرو بن عاص کے بھتیجے (؟) عقبہ بن نافع نے، جن کا ذکر اوپر بھی ہوچکا ہے، برقہ کے فوجی مرکز سے اس کام کا آغاز کیا۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے سپہ سالاروں کے نام ہیں جو چھوٹی چھوٹی مہیں بربری قبائل اور شہروں کے خلاف لے جاتے تھے۔ انھیں میں قدیم لپتا کا شہر بھی تھا۔ یہ واقعات ۶۶۰ء سے ۶۶۳ء تک جاری رہے۔ ان کی تفصیلات مشتبہ ہیں، اور اس کے بعد جو زمانہ آیا وہ تاریخی لحاظ سے اور بھی زیادہ تاریک ہیں۔ غالباً عمرو بن عاص کی وفات کے بعد افریقہ کی حیثیت خود مختار صوبے سے ذرا ہی کم تھی۔ کیونکہ معاویہ بن حُدَیج کو وہاں بھیجا گیا تھا جو امیر معاویہ کے ہمدرد تھے، اور حضرت عثمان کے بعد خانہ جنگی میں بھی انھوں نے حصہ لیا تھا۔ ان کا تقرر براہ راست خلیفہ کی طرف سے ہوا تھا، اور وہ بربریوں اور بازنطینیوں کے متحدہ محاذ کے خلاف ایک زبردست فوج لے کر وہاں آئے تھے۔ انھوں نے متحدہ فوجوں کو شکست دی اور جلولا کا قلعہ فتح کیا۔ معاویہ بن حُدَیج کی تمام کوششوں کو ان بحری مہموں سے بڑی مدد ملی، جو بازنطینیوں کی توجہ مبذول کرنے کی غرض سے صقلیہ کے خلاف بھیجی گئی تھیں۔ ان کے متعلق تفصیل آگے آئے گی۔ ایک حد تک وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ واقعہ ۶۶۴ء میں پیش آیا تھا۔

اس کے بہت جلد بعد معلوم ہوتا ہے کہ عقبہ بن نافع دوبارہ معاویہ بن حُدَیج کے جانشین ہوئے تھے، صحرائے اعظم کے شمالی کناروں کے نخلستانوں تک ایک زبردست کوچ کے بعد، جہاں انھوں نے عربی حکومت دوبارہ قائم کی۔ وہ ۶۷۰ء میں افریقۂ خاص کے خلاف ایک فوج لے کر گئے، اور یہاں انھوں نے عربوں کی مشہور و معروف چھاؤنی قیروان کے نام سے قائم کی۔ بصرہ اور کوفہ کے نمونے پر قیروان ایک چھاونی بھی تھا، اور فوجی اہمیت رکھنے والا ایک مرکز بھی۔ چند سال بعد عقبہ بن نافع کو واپس بلا لیا گیا۔

معاویہ بن حُدَیج اور عقبہ بن نافع کے زمانے میں افریقہ مصر سے بالکل الگ ایک صوبہ بن چکا تھا۔ لیکن اُسے پھر مصر سے ملحق کرا دیا گیا۔ نئے فوجی حاکم مصر مسلمہ بن مُخَلَّد نے اپنے ایک آزاد غلام (مولا) دینار ابو المہاجر کو عقبہ بن نافع کے جانشین کے طور پر افریقہ بھیجا۔ ابو المہاجر نے عقبہ کو گرفتار کر کے ہتھکڑیاں پہنا دیں۔ کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمہ کو عقبہ بن نافع کی حکمت عملی سے اتفاق نہیں تھا اور بڑی حد تک ابو المہاجر کا خیال درست بھی تھا۔ کیونکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو عقبہ بن نافع محض ایک بلند حوصلہ عرب فارس تھے جنھیں نہ تو انجام کا خیال تھا اور نہ کسی حکمت عملی کا۔ ان میں حد درجے کی جسارت ضرور تھی، مگر ساتھ ہی وہ مصالحت کے خوگر نہیں تھے۔ اور چاہتے تھے کہ بجائے تدبر کے تلوار کے زور سے عربوں کو فاتح بنائیں۔ وہ نہایت بے رحمی سے مرتدین کو موت کی سزا دیتے تھے۔ مگر واقعہ یہ تھا کہ جب تک عربوں کی فوجیں ان کے گرد و نواح میں رہتی تھیں بربری بڑی تعداد میں اسلام قبول کر لیتے تھے، اور عرب فوجوں کے ہٹتے ہی اسلام سے منحرف ہو جاتے تھے۔ عقبہ بن نافع نے ایک مغرور بربری سردار کے ساتھ، جو ان سے مل گیا تھا، نہایت غیر مدبرانہ سلوک کیا۔ ان کے مشہور فوجی کوچ فارسانہ تہور سے زیادہ کچھ حیثیت نہ رکھتے تھے، اور آخر میں بالکل بے نتیجہ رہتے تھے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ایسے ہی کوچ قدیم عربی فروسیت کی جان تھے، اور یہی وجہ ہے کہ جب ایک کوچ کے دوران میں عقبہ بن نافع شہید ہوئے تو ان کی

شہرت اور بھی بڑھ گئی۔ چنانچہ آج تک شمالی افریقہ میں سیدی عقبہ ایک مقدس ترین ولی کی حیثیت سے مانے جاتے ہیں، حالانکہ تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ ابو المہاجر نے، جو بالکل گمنام ہو گیا، ان سے کہیں زیادہ بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ کیونکہ یہی ابو المہاجر تھا جس نے پہلی مرتبہ بازنطینیوں کے خلاف تندہی سے کام کیا، اور دوسری طرف پہلی مرتبہ یہ کوشش کی کہ بربریوں کے ساتھ سمجھوتے کے لئے راستہ صاف کرے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے بربری قبائل، اور خصوصاً ان کے سردار اعلیٰ کسیلہ کے ساتھ بڑے دوستانہ تعلقات قائم کر لئے تھے، کیونکہ کسیلہ کی عظمت اور برتری کو اس نے پوری طرح سمجھ لیا تھا۔ اسی بربری سردار کی مدد سے وہ رومیوں سے لڑنے کے لئے قرطاجنہ کی طرف روانہ ہوا۔ وہ اس شہر پر تو قبضہ نہ کر سکا لیکن گرد و نواح کے علاقے میں اس نے اپنے قدم جمائے۔ اس کے بعد وہ مغرب کی طرف تلمسان تک بڑھتا چلا گیا۔ یہ کامیابی بربریوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کئے بغیر ناممکن تھی۔

لیکن اسی دوران میں یزید بن معاویہ کی طرف سے عقبہ بن نافع کو ۶۸۱-۶۸۲ء میں دوبارہ شمالی افریقہ کا حاکم مقرر کر دیا گیا۔ انھوں نے آتے ہی دینار سے اپنا بدلہ لیا، اور اسے ہتھکڑیاں پہنا کر تمام کوچوں میں اپنے ساتھ رکھا۔ دینار نے اپنے زمانے میں سیاسی اور فوجی مرکز تبدیل کر دیا تھا، لیکن عقبہ بن نافع نے قیروان کو پھر مسلمانوں کا فوجی مرکز قرار دیا، اور پھر بربریوں کے ساتھ وہی پرانے عربوں کا سا مغرورانہ سلوک روا رکھا۔ مختصر یہ کہ انھوں نے اپنے پیشرو کے طرز عمل کی مخالفت شروع کی۔ جو کچھ نتیجہ ہوا اُس سے معلوم ہو گیا کہ ابو المہاجر کی حکمت عملی کہاں تک درست تھی۔ کیونکہ طاقت ور کسیلہ نے بربریوں کو عقبہ کے خلاف بھڑکایا، اور موقع ملتے ہی خود بھی عقبہ کی چھاؤنی سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس طرح ابو المہاجر کے مقابلے میں عقبہ بے انتہا نامساعد حالات میں مغرب کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ تلمسان سے آگے بڑھ کر طنجہ پہنچے، معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کوہستان اطلس کو بھی عبور کیا اور آخر بحر اوقیانوس کے

کنارے تک آئے، لیکن جب وہاں سے واپس ہوئے تو وہ خود اور ان کا قیدی ابو المہا جر شورشی بربریوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ اس موقع پر مسلمانوں نے جو نقصان برداشت کیا اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ عقبہ نے غلطی سے تمام مغربی علاقے کو مفتوح سمجھ لیا تھا، اور اپنی فوج کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کرکے بے کار کر دیا تھا۔ ایک اور وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ وہ اپنی فوج کو، جو اب مال غنیمت سے لدی ہوئی تھی، اکٹھا نہ رکھ سکے۔ اس طرح وہ بسکرہ کے قریب تہوذہ کے مقام پر ۶۸۳ء میں شہید ہو گئے۔ ان کا شہید ہونا تھا کہ بربری بوقت واحد عربوں کے خلاف کھڑے ہو گئے، اور بازنطینیوں سے دوبارہ اتحاد قائم کر لیا۔ عربوں کو مجبوراً افریقہ خالی کرنا پڑا، زہیر بن قیس، حاکم قیروان نے فوجیں وہاں سے ہٹا لیں۔ اب کسیلہ کے لئے راستہ کھلا ہوا تھا کہ بلا مزاحمت اپنی بے ترتیب فوج لے کر افریقہ میں گھومتا پھرے۔ اس طرح یزید بن معاویہ کی موت کے وقت تمام افریقہ سوائے برقہ کے، ایک دفعہ پھر مسلمانوں نے کھو دیا۔ اس کے علاوہ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مشہور و معروف عقبہ بن نافع کے متعلق تاریخ کا اصلی اور حقیقی فیصلہ کیا ہو گا۔

اگر ہم عرب مورخوں کے بیان کو صحیح مان لیں تو توقع کے خلاف عبد الملک نے عبد اللہ بن زبیر کی مخالفت اور شورش کے فرو ہونے کے بعد ہی افریقہ کی طرف فوراً توجہ نہیں کی۔ بلکہ اس نے ۶۸۶ء-۶۸۹ء میں افریقہ میں اسلامی حکومت کو دوبارہ قیام و ثبات بخشنے کی نئی کوشش شروع کی۔ اس کے علاوہ جو نئی فوجی مہم زہیر بن قیس کے ماتحت بھیجی گئی تھی، وہ بازنطینیوں کے خلاف نہیں، بلکہ کسیلہ کے خلاف تھی۔ کیونکہ بازنطینیوں کا ہمیشہ سے یہ قاعدہ چلا آتا تھا کہ وہ خود تو چالاکی سے اپنے شہروں میں بیٹھے رہتے تھے اور بربریوں کو بطور رسد کے استعمال کرتے تھے۔ زُہیر بن قیس نے پہلے تو ان مسلمانوں کو آزادی دلائی جو بربری حکومت کے تحت قیروان میں رہتے تھے اور پھر وہ کسیلہ کے مرکز کوہ اورسیوس کی طرف بڑھے۔ کسیلہ کو ایک خون ریز لڑائی میں شکست ہوئی، اور وہ کام آیا۔ زُہیر کی فوجیں سکا ونیریا (Sicca Veneria) یعنی

موجودہ کیف اور غالباً اس سے بھی آگے تک بڑھتی چلی گئیں۔ لیکن اس کوچ میں عرب فوج کی تمام قوت صرف ہوگئی۔ واپسی میں زہیر کا وہی انجام ہوا جو اس سے قبل عقبہ کا ہو چکا تھا۔ بازنطینیوں نے زہیر کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر برقہ پر حملہ کر دیا، اور یہیں زُہیر چند وفادار سپاہیوں کے ساتھ شہید ہو گئے۔

لیکن ان تمام انقلابات میں قیروان بدستور عربوں کے ہاتھ میں رہا۔ اب حُسّان بن نُعمان افریقہ کا حاکم مقرر کیا گیا تھا، اور یہی شخص ہے جس نے افریقہ میں حقیقی امن و امان قائم کیا۔ حسان بن نعمان پہلا شامی امیر تھا جو افریقہ بھیجا گیا۔ اس لحاظ سے وہ مرکزِ خلافت کا بہترین تربیت یافتہ افسر تھا، اور اس کے ساتھ ہی وہ زبردست مدبر بھی تھا۔ حسان نے بالکل وہی سیاسی طرزِ عمل اختیار کیا جو اس سے قبل ابو المہاجر اختیار کر چکا تھا۔ سب سے پہلے اس نے یہ محسوس کیا کہ افریقہ میں مسلمانوں کے حقیقی دشمن اور مخالف بازنطینی ہیں۔ چنانچہ جوں ہی اُس کے پاس خلیفہ کی بھیجی ہوئی امدادی فوجیں پہنچ گئیں، وہ قرطاجنہ کی طرف روانہ ہوا، جو اُس وقت بازنطینی صوبۂ افریقہ کا ناقابلِ تسخیر صدر مقام سمجھا جاتا تھا۔ اس نے ۶۹۷ء کے موسمِ گرما میں یہ شہر فتح کر لیا۔ اس فتح کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس نے تُونس کے شمال مشرق میں صَفطُورَہ کے مقام پر بلا کسی مزاحمت کے بربریوں اور بازنطینیوں کا اتحاد توڑ دیا، جو بزرتہ[1] میں دونوں قوموں کی فوجوں نے قائم کیا تھا۔ لیکن اسی سال کے موسمِ خزاں میں عربوں نے ایک مرتبہ پھر بطریق یانس کے مقابلہ میں قرطاجنہ کھو دیا۔ ۶۹۸ء کے موسمِ گرما میں بازنطینیوں کے زبردست بیڑے کو عربوں کے بیڑے نے، جو رفتہ رفتہ طاقتور ہوتا جا رہا تھا، شکست دی۔ اس واقعہ نے قرطاجنہ کی قسمت کا آخری فیصلہ کر دیا۔ عرب رفتہ رفتہ سمندر کے مالک بنتے جا رہے تھے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ یہ تمام کامیابیاں جو حسان کو ہو رہی تھیں محض بری فوج کی وجہ سے نہ تھیں، بلکہ شمالی افریقہ کی قسمت کا آخری فیصلہ بحری قوت کی طرف سے ہونے والا تھا۔ بربریوں کے متعلق حسان کی حکمتِ عملی زیادہ

[1] Bizerta

کامیاب نہیں رہی۔ ان میں ایک نام نہاد غیب دان، روشن ضمیر عورت ظاہر ہوئی جو کاہنہ کہلاتی ہے۔ اس نے بربریوں کے تمام قبائل میں ایک بار پھر اتحاد کی روح پھونک دی، اور اس طرح وہ اصلی معنوں میں کسیلہ کی جانشین بنی۔ کوہ اوریوس کے آگے وادی سکتانہ کے کنارے باغایہ کے قریب اُس نے حسان کی فوج کے ٹکڑے اڑا دئے، اور اس کی یہ حالت کردی کہ وہ طرابلس الغرب کی طرف بھاگنے پر مجبور ہوا۔ لیکن فتح وظفر کے اس سلسلے کو کاہنہ جاری نہ رکھ سکی، اور حسان کے اعلیٰ تدبر کا اندازہ اس سے ہوگا کہ اُس نے طرابلس الغرب میں بیٹھے بیٹھے مختلف بربری قبائل اور سرداروں کو کاہنہ سے توڑ کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس طرح تقریباً ایک سال بعد حسان کو کاہنہ پر ایک زبردست فتح ہوئی، جسے درحقیقت بربریوں کے ساتھ عربوں کے برادرانہ تعلقات کا نقطۂ آغاز سمجھنا چاہیے۔ کاہنہ کے خلاف جو جنگیں ہوئیں ان کے سنین کا تعین، اور قرطاجنہ کے خلاف مہموں سے ان کا تعلق بیان کرنا محال امر ہے۔ اگر ان کاہنہ والی جنگوں کو قرطاجنہ کی دو فتحوں کے درمیان سمجھ لیا جائے، جیسا کہ غالباً واقعہ بھی ہے، تو تمام سنین کا تعین ایک حد تک ممکن ہو جاتا ہے۔ بہرکیف یہ بالکل ظاہر ہے کہ کاہنہ کے مقابلہ میں حسان کی شکست قرطاجنہ کی فتح کے بعد ہوئی تھی، اور اس کی فتح ۷۰۲ء میں کہیں واقع ہوئی ہے۔ مزید براں، صرف بری فوج ہی نے اس میں حصہ نہیں لیا تھا، بلکہ اس کامیابی میں سب سے بڑا حصہ عربی بیڑے کا تھا، جس نے بازنطینی ساحلی شہروں پر قبضہ کرنے اور انھیں اپنے قابو میں رکھنے کا بڑا اہم کام انجام دیا۔ اسی بیڑے کی وجہ سے بازنطینی قرطاجنہ پر اپنا قبضہ قائم نہ رکھ سکے۔ لیکن بربریوں سے اب جو صلح ہوئی اُس کی وجہ سے بربری اور عرب بالکل مل گئے۔ اس واقعہ سے بالآخر ان بازنطینی شہروں کی قسمت کا فیصلہ ہوگیا جو اب تک عربوں کی مزاحمت کر رہے تھے۔ اب بربری قبائل کے وہ سردار جو عربوں کے زیرِ سیادت آگئے تھے، اسلام کے جھنڈے کے نیچے، مغرب میں ان قبائل کی طرف روانہ ہوئے جو اب تک خود مختار تھے۔ مالِ غنیمت حاصل کرنے کی ایک عام توقع اور اراضی پر قبضہ کرنے کی امید نے ان دونوں قوموں کو، جو اس سے ذرا ہی پہلے ایک دوسرے کی دشمن تھیں، دست

بنا دیا۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ ان دونوں کی زندگی میں بڑی حد تک یکسانیت بھی تھی۔ اب وہ زمانہ قریب تھا کہ جب آبادی کے اس سیلاب کے لئے جو اسلام کی وجہ سے یک بارگی ٹوٹ پڑا تھا، افریقہ تنگ ہو جائے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شہری آبادی نے جو لاطینی تہذیب و تمدن کی خوگر تھی، نقل مکان کیا اور اندلس یا صقلیہ چلی گئی۔ اس کے بعد ایک حیرت انگیز قلیل عرصے میں لاطینی تہذیب شمالی افریقہ سے بالکل نیست و نابود ہو گئی۔

عربوں نے شمالی افریقہ کو اُس وقت مکمل طور سے فتح کیا جب انھوں نے محض مالِ غنیمت حاصل کرنے کی سیاسیات ترک کر کے مستقل قبضے کا طریقہ اختیار کیا۔ اس سیاسی تبدیلی کا آغاز عقبہ بن نافع کے قیروان آباد کرنے سے ہوا۔ اس شہر کی بنا کے بعد نقطۂ نظر میں تبدیلی واقع ہوئی۔ سب سے پہلے ابو المہاجر نے یہ طریقہ عملاً اختیار کیا کہ کھلے میدانوں کو نہ لوٹا جائے، بلکہ مستحکم قلعبند شہروں پر قبضہ کیا جائے۔ بربری قبائل کے ساتھ اس کی یہ حکمت عملی بہت کام آئی۔ جب خلیفہ عبد الملک اسلام کا دوبارہ اتحاد قائم کر چکا تو بہت سی فوجیں افریقہ کی جنگوں میں حصہ لینے کے لئے آزاد ہو گئیں، اور اس کے علاوہ جنگی بیڑے سے بھی اتحادِ عمل کا موقع ملا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک خدا داد قابلیت رکھنے والا طباع اور روشن دماغ مدبر بھی میسر آ گیا، جس نے ابو المہاجر کی اس حکمت کو دوبارہ جاری کیا کہ بربریوں کے ساتھ ایک بڑے پیمانہ پہ تعلقات پیدا کئے جائیں۔ یہ شخص حسان بن نعمان تھا۔

حسان کی سیاسی حکمت عملی کو موسےٰ بن نُصَیر نے بدستور قائم رکھا، اور یہی شخص ہیں جنہوں نے حقیقی معنوں میں افریقہ میں امن قائم کیا۔ وہی اندلس کے فاتح بھی ہیں۔ ان کے متعلق حقیقت میں تمام روایات اور سنین کا تعین غیر یقینی ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ۷۰۸ء میں موسےٰ بن نصیر اپنی خدمت کا جائزہ لے چکے تھے، ان کی حکومت کا ابتدائی زمانہ مغربی بربریوں کو فتح اور انھیں مطیع کرنے میں اور آخری زمانہ اندلس کی فتح میں بسر ہوا، جس میں انھیں ان کے ایک آزاد کردہ غلام طارق نے سپہ سالار کی حیثیت سے بہت مدد دی۔ اندلس کی فتح کو مشکل ہی سے

عربوں کی توسیع کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ بے شمار نومفتوح بربری قبائل نے اس توقع پر اس فتح میں حصہ لیا کہ اسلام کے جھنڈے کے نیچے انھیں مال غنیمت بڑی مقدار میں حاصل ہو گا۔ خود دارالخلافہ میں بھی ایسی دور افتادہ مہموں کو مشتبہ نظروں ہی سے دیکھا جاتا تھا۔

بہرکیف تمام تجویزوں پر عمل کرنے میں دیر نہ لگی ہوگی۔ کیونکہ واقعات یکے بعد دیگرے جلدی جلدی پیش آتے گئے، اور تنزل پذیر قوطی حکومت فاتحین کے دامن میں ایسے گر پڑی جیسے پکا ہوا میوہ درخت کی شاخ سے بلا تکلف ٹپک پڑتا ہے۔ اس فتح کا سبب تاریکی میں ہے۔ تاریخ میں بیان ہوا ہے کہ اندلس میں تخت و تاج کے متعلق جھگڑے تھے اور آخری قوطی بادشاہ راڈرک، جسے عرب لذریق لکھتے ہیں اور جس نے عربوں کے مقابلے میں شکست کھائی تھی، غاصب تھا۔ بظاہر نہ ملک اس کا ہمدرد تھا اور نہ رعایا۔ روایات میں ایک ڈیوک جولین کا بھی ذکر ہوا ہے، جو افریقہ کے شہر سبتہ کا مسیحی حاکم تھا، اور جس کی بیٹی کی لذریق نے بے حرمتی کی تھی۔ روایات کے مطابق یہی شخص تھا جو ذاتی انتقام لینے کی غرض سے بربریوں اور عربوں سے معاہدہ کر کے انھیں اندلس لے گیا۔ ابتدائی اسلام کی تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جسے مورخوں نے اس قدر قابل اعتنا سمجھا جو جتنا کہ جولین کو، حالانکہ اس کے متعلق یہ بھی یقینی طور پر معلوم نہیں کہ وہ کس قوم سے تھا، اور کس سلطنت کے زیر سیادت تھا۔ دلہاؤسن اور کودیرا[^1] کے قطعی بیانات کے مطابق اُس کا نام بھی جولین نہیں تھا، بلکہ اربن[^2] تھا۔ غالباً وہ بربری الاصل تھا، اور قوطی بادشاہ کے وابستگان سے تھا۔ اس لحاظ سے وہ یقیناً سرکاری مذہب عیسائیت سے تعلق رکھتا ہو گا۔ بہرحال اس کی تاریخی حیثیت اور اندلس کی فتح سے اُس کے تعلق میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے ماسوا اس کے متعلق باقی تمام باتیں محض مفروضات ہیں۔

بظاہر قوطی سلطنت میں تخت و تاج کے جھگڑے اور تاخت و تاراج کی امیدیں وہ

---

[^2]: Urban
[^1]: Codera

چیزیں تھیں جن کی بنا پر ۷۱۱ء میں طارق سات ہزار بربریوں کے ساتھ جن کی تعداد بعد میں بارہ ہزار تک پہنچی، اندلس روانہ ہوا اور سمندر عبور کر کے اُس پہاڑ کے قریب اترا جو آج تک اس کے نام پر جبل الطارق کہلاتا ہے۔ اس زبردست مہم سے قبل ۷۱۰ء کے موسم گرما میں ایک اور منظم مہم بھیجی گئی تھی، جس کے نتائج دیکھ کر عرب طارق کی مہم بھیجنے پر آمادہ ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ طارق نے جبل الطارق پر اتر کر اور اپنی فوجوں کو جمع کر کے ملک کے ساحلی علاقے کو غیر محفوظ بنا دیا تھا، اور جنوب میں لاجنڈ کی جھیل کے گرد گھوما تھا۔ اس جھیل اور مدینہ سدونیہ کے درمیان، اُس وادی میں آج کل سلادو (وادی بنکہ) کہلاتی ہے، لذریق سے اس کا مقابلہ ہوا۔ اندلسی روایات کے مطابق معرکۂ جنگ کا جاء وقوع ایک اور جگہ بھی بیان کیا گیا ہے، جسے اس نواح میں تلاش کرنا چاہئے۔ یہیں جولائی ۷۱۱ء میں ایک فیصلہ کن جنگ واقع ہوئی۔ جس میں قوطی فوج، جو تعداد اور ساز و سامان میں عربوں سے کہیں بڑھی ہوئی تھی، لذریق کے سیاسی مخالفین کی غداری کے طفیل، طارق کی فوجوں کے ہاتھوں بالکل تباہ ہو گئی۔ خود بادشاہ بھی غالباً اس جنگ میں کام آیا، بہر حال اس دن کے بعد اُس کا نام کہیں سنائی نہیں دیا۔

اس فیصلہ کن فتح کے بعد ایک فاتحانہ کوچ شروع ہوا، جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی، اور جس سے بالکل صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ قوطی حکومت ملک کے باشندوں کے لئے ناقابل برداشت ہو گئی تھی، اور انھیں اس سے سخت نفرت تھی۔ بدترین سیاسی اور مذہبی حکمت عملی کے سبب، بازنطینی علاقوں کی طرح یہاں بھی آبادی کے مختلف عناصر ایک دوسرے کے خلاف تھے، ان چیزوں نے ملک کو اس حملے اور اس کی کامیابی کے لئے بالکل تیار کر دیا تھا۔ خصوصاً یہودی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے خلاف کلیسا نے ایک جنگ استیصال جاری کر رکھی تھی، جس میں بے ایمانی اور ایمانداری کی بھی پرواہ نہیں کی جاتی تھی۔ اس قوم نے عربوں اور بربریوں کو اپنا ناجی سمجھا۔ صرف ان شہروں نے جہاں قوطیوں کے بہترین فارسی موجود تھے، حملہ آوروں کی قابل توجہ مزاحمت کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ طارق ملک کے کوائف سے بخوبی واقف تھا۔ مورخوں کا بیان ہے کہ

تمام کوچوں کے دوران میں جولین طارق کا رہنما رہا، اور اسی کے مشوروں پر عمل ہوا۔ اس فتح سے بہر حال اتنا ہوا کہ قوطی دار السلطنت طلیطلہ کی طرف کوچ کرنے کے منصوبے باندھے گئے۔ جنوب میں اشبیلہ جیسے بڑے بڑے شہروں نے خود بخود اپنے آپ کو عربوں کے حوالے کر دیا اور دوسرے مقامات جیسے ارکیدونہ اور مالقہ کو چھوٹے چھوٹے فوجی دستوں نے فتح کر لیا۔ فوج کا بڑا حصہ استجہ اور قرطبہ ہوتا ہوا طلیطلہ کی طرف بڑھا۔ طارق کو صرف استجہ میں مزاحمت پیش آئی۔ یہاں ایک جنگ واقع ہوئی جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ تمام فاتحانہ کوچوں میں یہی سب سے زیادہ خون ریز تھی۔ قرطبہ اور طلیطلہ کو غداروں نے مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ امراء اور متعدد مذہبی پیشواؤں کا طبقہ مسلمانوں کے ملک میں آنے پر پہلے تو ان سے الگ رہا، اور پھر جان و مال کی ضمانت لے کر فاتحین سے مل گیا۔

اس طرح ۷۱۱ء میں موسم گرما کے آخر تک طارق نصف اندلس کا مالک بن چکا تھا۔ اس کی بے مثل فتوحات نے آخر اُس کے مربی اور افسر اعلیٰ موسیٰ بن نُصَیر کی آنکھیں کھول دیں۔ وہ اس وقت تک بالکل بے فکر شمالی افریقہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اب انھیں اپنے سپہ سالار سے حسد پیدا ہوا۔ کیونکہ طارق کے ماتحت جو مہم بھیجی گئی تھی وہ اندلس کی باقاعدہ فتح کے لئے نہیں تھی، بلکہ اس کی حیثیت محض صائفہ کی تھی، یعنی ان اسلامی مہموں کی جو موسم گرما میں ہمیشہ دشمن کے ملک میں بھیجی جاتی تھیں۔ لیکن خلاف توقع طارق نے قوطی حکومت کا بالکل استیصال کر دیا تھا۔ موسےٰ چاہتے تھے کہ اندلس جیسے دولت مند ملک کی فتح کی عزت اور حقیقی فائدہ انھیں حاصل ہو۔ اس لئے وہ بھی آئندہ سال کے شروع میں اٹھارہ ہزار آدمیوں کو لے کر اندلس چلے، اور ماہ جون میں وہاں پہونچے۔ دیدہ و دانستہ انھوں نے طارق کا راستہ ترک کیا، اور سب سے پہلے وہ شہر فتح کئے جو اب تک مزاحمت پر تلے ہوئے تھے۔ ان میں اور شہروں کے علاوہ مدینہ سدونیہ، قرمونہ اور اشبیلیہ بھی شامل تھے۔ اشبیلیہ اندلس میں علم وفن کا مرکز تھا، رومیوں کے زمانے میں صدیوں تک حکومت کا مرکز رہا تھا، اور قوطیوں کے عہد میں بھی اس کی قدیم

شان و شوکت میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ مسلمان اُسے چند مہینے کے محاصرے کے بغیر فتح نہ کر سکے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ موسیٰ کے کوچ سے ثابت ہوتا ہے کہ طارق نے جو شکستیں اب تک اہل اندلس کو دی تھیں ان سے مزاحمت بالکل ختم نہیں ہوئی تھی، بلکہ دارالسلطنت کے اس قدر جلد فتح ہو جانے کے بعد ملک کی اصلی فتح نہایت تکلیف دہ حالات میں شروع ہوئی تھی۔ اگر اندلس میں پہلے ہی طرح طرح کے فتنہ و فساد پھیلے ہوئے نہ ہوتے، اور ضبط و تنظیم کا بالکل خاتمہ نہ ہو گیا ہوتا تو ناممکن تھا کہ عرب ملک کو فتح کر سکتے۔ خود موسیٰ کو بھی اشبیلیہ کی فتح کے بعد ماردہ میں ایک زبردست مزاحمت پیش آئی، جس کی ناقابل تسخیر فصیل پر تمام حملے اور ریلے ناکام ثابت ہوئے۔ لیکن آخر کار وہاں کے باشندوں نے دیکھا کہ ان کا فائدہ اس میں ہے کہ شہر صلح کے ذریعہ عربوں کے حوالے کر دیا جائے۔ (۳۰ جون ۷۱۳ء)۔ اس کے علاوہ اشبیلیہ میں ایک مرتبہ پھر بغاوت ہوئی لیکن موسیٰ کے بیٹے عبدالعزیز نے بالآخر اسے مستقل طور پر فتح کر لیا۔ ان واقعات کے بعد موسیٰ طلیطلہ پہنچے، جہاں طارق ان کا انتظار کر رہا تھا۔

اب موسیٰ نے اپنے کامیاب ماتحت افسر پر اپنا غصہ نکالا۔ لیکن بہت جلد خود ان کا بھی یہی انجام خلیفہ کے ہاتھوں ہوا۔ طلیطلہ آنے کے چند ہی ہفتہ بعد انھیں خلیفہ کا حکم ملا کہ وہ فوراً واپس چلے آئیں (۷۱۳ء۔ ۷۱۴ء) اس حکم کی تعمیل میں یہ فاتح بڈھا سپہ سالار بے اندازہ مال و دولت لے کر خشکی کے راستے آہستہ آہستہ شام کی طرف روانہ ہوا۔ برٹش میوزیم میں جو عربی فائیر محفوظ ہیں ان سے اس سفر میں موسیٰ کے شاہانہ کر و فر کا حال معلوم ہوتا ہے، اور یہ پتہ چلتا ہے کہ مصر کے مختصر قیام کے دوران میں اُنھوں نے کتنی دولت خرچ کی تھی۔ دمشق پہنچے تو خلیفہ ان پر بہت ناراض ہوا، اور پھر کوئی خدمت ان کے سپرد نہیں کی گئی۔ نہ صرف یہ بلکہ اُن کے بیٹوں کو بھی خمیازہ بھگتنا پڑا، اور وہ بھی اپنے باپ کے کارناموں سے کما حقہ فائدہ نہ اٹھا سکے۔ ان کا بیٹا عبدالعزیز حاکم اندلس قتل کیا گیا اور دوسرے بیٹے عبداللہ حاکم افریقہ کو معزول کیا گیا۔

اسلامی فتح اندلس کے متعلق جو کچھ اوپر بیان ہوا وہ زیادہ تر عربی اسناد پر مبنی ہے، لیکن

اس زمانے کے بعد کی لاطینی تاریخوں سے بھی عربی بیانات کی توثیق ہوتی ہے۔ لاطینی تاریخوں میں بجائے طارق کے موسےٰ کو اندلس کا اصلی اور حقیقی فاتح ظاہر کیا گیا ہے۔ طارق محض جبل الطارق کا فاتح ہے، مگر فتح کی تکمیل موسےٰ کے ہاتھوں اُس وقت ہوئی جب اُس نے طلیطلہ فتح کیا۔ طارق اور موسیٰ کے درمیان اختلاف کا ذکر لاطینی مورخ نہیں کرتے۔ عربی اور لاطینی دونوں اسناد سے پتہ چلتا ہے کہ گو موسےٰ یا اُس کے زیر ہدایت، اسلامی فوج نے سرقسطہ پر قبضہ کر لیا تھا، لیکن جبل برانس کو عبور نہیں کیا تھا۔

جبل برانس کے عبور کرنے کا واقعہ چند سال بعد ۷۱۷ء یا ۷۱۸ء میں پیش آیا، جب کہ موسیٰ کا چوتھا جانشین حُر اندلس کا حاکم تھا۔ اس کی سرکردگی میں یہ واقعہ پیش آیا۔ جبل برانس کے شمال میں ایک عام خانہ جنگی جاری تھی، اور ہر شخص دوسرے کے خلاف لڑ رہا تھا۔ اس ابتری اور افراتفری سے عربوں نے فائدہ اٹھایا۔ مگر مسلمانوں کا یہ خیال کہ وہ جبل برانس کو عبور کر افرنجی قوم کے علاقوں میں سے گذرتے ہوئے براہ خشکی قسطنطنیہ فتح کرلیں گے، محض جغرافی ناواقفیت پر مبنی تھا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ قیصر کے عظیم الشان دار السلطنت پر قبضہ کرنا خلفا کی خارجی حکمت عملی کا سب سے بڑا مسئلہ تھا، گو اس وقت اس طریقے سے اُس کا حصول ناممکن تھا۔ اس کے برعکس ان سپہ سالاروں کا، جو باہر فوجیں لے جاتے تھے، مقصد کچھ اور ہی ہوتا تھا۔ ان لوگوں کو سب سے زیادہ دلچسپی مال غنیمت میں تھی۔ وہ اس بے شمار مال و دولت کے خواہاں تھے جو افرنجی سلطنت کی مسیحی خانقاہوں اور کلیسا کے خزانوں میں بھری پڑی تھی۔ وہ جرات آزما فوجی کوچ، جن کا انجام بالآخر تورس (یا پوانتئے) کی شکست پر ہوا، ان کا ذکر تمام اسناد میں موجود ہے، اور ان کا مقصد صرف یہی ہوتا تھا۔ افرنجی سلطنت کے جنوب میں مورووینجی خاندان کے دارغۂ محل اور اکوتین کے ڈیوکوں میں مسلسل جنگ جاری تھی۔ شمال میں ایک طرف تو خونریز جنگوں کی بدولت مستقبل کی افرنجی سلطنت بن رہی تھی، اور دوسرے طرف اکوتین کے ڈیوکوں کی حکومت ہر سمت میں مختلف خطروں سے دوچار ہو رہی تھی۔ اکوتین کے ڈیوک ایودو نے عربوں اور بربریوں کے پہلے سیلاب کو

تن تنہا برداشت کر لیا تھا، لیکن اب یہ حالت ہوگئی تھی کہ انھیں روکنے کے لئے اسے اپنے حریف چارلس مارٹل سے مدد مانگنی پڑی تھی، اور اس کی مدد سے آخر یہ سیلاب روکا گیا۔

حُر کی یورش کی تفصیلات سے ہم بے خبر ہیں۔ اس کے جانشین سمح نے ان مہموں کو جاری رکھا۔ اسی نے ۷۲۰ء میں اربونہ (ناربون) فتح کیا، جو ۷۵۹ء تک ان فوجی مہموں کا مرکز رہا جو اندلس سے باہر بھیجی جاتی تھیں۔ اس سے قطع نظر، سمح کی دوسری مہیں ناکام رہیں۔ ۷۲۱ء میں اس نے طولوش (تولوز) فتح کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ اپنی محاصرے کی کلوں کے ذریعہ سے اُسے صرف جلانے میں کامیاب ہوا۔ ڈیوک ایودو نے اس محصور شہر کو بچالیا، اور ایک فیصلہ کن فتح بھی حاصل کی۔ مسلمانوں کا سپہ سالار جنگ میں کام آیا۔ یہ جنگ فاتح مسلمانوں کے مقابلے میں جرمن حکمرانوں کی پہلی کامیابی تھی، لیکن آخری کامیابی نہیں تھی۔ کیونکہ اس کے بعد جو عربی مہیں یہاں آئیں انہیں کبھی کوئی بڑی فتح حاصل نہیں ہوئی، اور ڈیوک ایودو نے عربوں اور بربریوں کے بڑھتے ہوئے اختلاف سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی۔ صرف ایک مرتبہ، طویل وقفہ کے بعد، اندلسی حاکم، امیر عبد الرحمٰن الغافقی نے افرنجی سلطنت پر ایک ضرب کاری لگانے کی کوشش کی۔ ۷۳۲ء میں اُس نے جبل برانس کو عبور کیا۔ جرونہ (ژ ارون) اور دوردوں کے درمیان ڈیوک ایودو سے اُس کا مقابلہ ہوا، اُس نے تورس کے قریب تک عبد الرحمٰن کا پیچھا کیا، کیوں کہ عبد الرحمٰن کا اصلی مقصد اس شہر کے کلیسا کا خزانہ لُوٹنا تھا۔ یہاں ایودو نے ضروری سمجھا کہ چارلس مارٹل سے مدد طلب کرے۔ چنانچہ ان دونوں کی متحدہ فوجوں نے عبد الرحمٰن کا مقابلہ کیا۔ تورس یا پواتئے کے مقام پر ۷۳۲ء میں ایک خون ریز جنگ واقع ہوئی، اور یہیں یہ بھی ثابت ہوا کہ شمال کے باشندے جنوب کے رہنے والوں پر کتنی فوقیت رکھتے ہیں۔ افرنجی مورخوں کے مطابق شمالی فوجیں سد سکندری کی طرح ثابت قدم اور برف کی طرح مستحکم رہیں، اور خلیفہ کی ہلکی سلح فوج سے ان کا مقابلہ ہوا۔ لیکن یہ صرف افرنجی اور عربی فوج ہی کا مقابلہ نہیں تھا، بلکہ دست بدست جنگ میں جرمنوں نے فوقیت حاصل کی، اور اس سے عیسائیوں کو یہ زبردست فتح حاصل ہوئی۔ گھمسان لڑائی کے بعد،

جس میں مسلمانوں کا سپہ سالار کام آیا، جب دوسرے دن یورپ کی فوجیں میدان جنگ میں آئیں، تو مسلمان میدان خالی کر چکے تھے۔ ان کا کمپ اور مال و اسباب فاتحین کے ہاتھ آیا۔

جنگ تورس کو اکثر تاریخ عالم کے بڑے بڑے فیصلہ کن واقعات میں شمار کیا جاتا ہے، کیوں کہ اب مغربی یورپ میں اسلام کی یورشیں آخر کار ختم ہوگئیں۔ گو اس کے بعد بھی، متعدد مرتبہ عربوں نے یورپ پر یورشیں کیں، جن کی تفصیل سے ہم پوری طرح واقف نہیں، اور جن میں انھوں نے آرلز اور اربونہ فتح بھی کیا، لیکن چارلس مارٹل نے انھیں ان دونوں شہروں سے بے دخل کر دیا۔ در حقیقت یہ تمام آخری یورشیں عربوں کی پس پائی کی مختلف منزلیں ہیں۔ یہاں عرب زبردست جنوبی افرنجی جتھوں سے ٹکر کھا رہے تھے، اور انھیں جتھوں نے چارلس مارٹل کی مدد سے عربوں کو ہر جگہ سے بے دخل کر دیا۔ یہ ضرور ہے کہ خلیفہ ہشام نے بڑی کوشش کی کہ توسیع برابر جاری رہے۔ مگر عربی سیلاب کا زور ٹوٹ چکا تھا، اور آخر ۷۵۹ء میں جبل برانس کے پار عربوں کو اپنا مرکز، یعنی اربونہ، بھی پپن کے حوالے کر دینا پڑا۔ جنگ تورس نے بظاہر عربوں کا سیلاب روک دیا۔ لیکن یہ صرف ظاہری چیز تھی۔ یہاں جو کچھ حقیقی واقعہ معلوم ہو رہا ہے وہ محض اتفاق تھا۔ ہر تحریک کی ایک حد ہوا کرتی ہے۔ اندلس کی فتح کے بعد عربوں کے پاس اتنے آدمی نہیں رہ گئے تھے کہ وہ آگے بڑھ سکیں، اور بربریوں کی مدد کے بغیر ان کا آگے بڑھنا ناممکن تھا۔ بربری عربوں سے متحد ہو کر ان میں تقریباً ضم ہو گئے تھے، اور ان کے لئے اندلس فتح کر چکے تھے۔ اب انھوں نے اس فاتحانہ تحریک کا رخ دوسری طرف پھیر دیا، لیکن اس کے ساتھ ہی دونوں قوموں کے اتحاد کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اب دونوں میں مخالفت شروع ہوئی۔ اس مخالفت کی وجہ سے تمام کام میں عین اس وقت رخنہ پڑا جب کہ عرب اپنی فتوحات کے عروج پر تھے، اور ان دونوں قوموں میں یہ بگاڑ ایسے نازک وقت میں جب ابھی جنگ تورس ختم ہوئی تھی نہایت نامبارک تھا۔ لیکن اس کے علاوہ ایک اور سبب بھی پیدا ہوگیا تھا جس سے افرنجی سلطنت پر عربوں کی یورشیں بالکل بند کر دیں، بلکہ ناممکن ہوگئیں۔ اسلامی حملے کی مزاحمت کرنے کی غرض سے بقیتہ السیف قوطی فوج اندلس کے شمال مشرق میں جمع ہوگئی تھی، اور وہاں ایک چھوٹی سی بالکل

خود مختار سلطنت قائم کر لی تھی۔ سال بسال یہ مختصر سی ریاست ترقی کرتی گئی، اور بالآخر عرب حکمرانوں اور جبل برانس کے درمیان ایک زبردست سد بن گئی۔ اس ریاست کو زمانۂ مابعد میں بلائی کی افسانوی شخصیت سے متعلق بتایا گیا، اور کہا گیا کہ اسی نے یہ ریاست قائم کی تھی۔

ان حالات کے تحت مسلمانوں کی توسیع قدرتی طور پر یکایک بند ہو گئی۔ اس سے معلوم ہوگا کہ یورپ میں عربوں کی سلطنت کی حد بندی کے اسباب اندرونی تھے نہ کہ بیرونی۔ ان باتوں کو جنگ تورس سے وابستہ کرنا اور یہ سمجھنا کہ صرف اسی کی وجہ سے یہ ترقی رک گئی تھی ایک زبردست غلطی ہے، اور اس جنگ کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ ان شہروں کی تاخت و تاراج سے عربوں کو افرنجی سلطنت میں مستقل طور پر قدم جمانے میں کوئی مدد نہیں ملی۔ اس کے برعکس قسطنطنیہ کی دیواروں کے نیچے عربوں کو جو شکستیں ہوئیں وہ ان کے لئے ان واقعات سے کہیں زیادہ اہم اور تباہ کن تھیں۔ قسطنطنیہ کی فتح یقیناً مشرق کی تمام تاریخ کو یک قلم بدل دیتی، جیسا کہ سات صدی بعد ہوا، جب عثمانی ترکوں نے یہ شہر فتح کر لیا۔

جنگ تورس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی یورپ میں عربوں کی وسیع ترین حدود سلطنت یہی تھی لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس جنگ سے عربوں کی توسیع یکایک بند اور ناممکن ہو گئی، بلکہ اس جنگ کو ان کی پسپائی کا آغاز سمجھنا چاہئے۔ یہاں پھر یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ پسپائی کا آغاز دراصل عربوں اور بربریوں کی مخالفت سے ہوا، اور یہی مخالفت عربوں کے لئے یقیناً مہلک ثابت ہوئی، خصوصاً اس لئے کہ اسی زمانے میں مشرق میں قیس اور کلب کی خونریز جنگوں کی وجہ سے سلطنت تباہی کے کنارے آ گئی تھی۔ اس نے اُس اتحاد کا خاتمہ کر دیا جو اندرونی لحاظ سے اس تحریک کی کامیابی کا ضامن تھا۔ ان حالات کی خصوصیات پر غور کرنا ہمارے موضوع سے باہر ہے۔ صرف اتنا کافی ہے کہ یہاں اہم واقعات کا ذکر کر دیا جائے، تاکہ ہم ان واقعات اور اسباب کو بخوبی سمجھ سکیں جنھوں نے عربوں کی توجہ کو مغربی یورپ سے ہٹا کر وسطی یورپ، یعنی صقلیہ، سردانیہ اور جنوبی اطالیہ کی طرف مبذول کر لیا۔

خلافت کا تمام مغربی حصہ، جو مغرب کہلاتا تھا، اور جس میں شمالی افریقہ اور اندلس دونوں شامل تھے، فتح اندلس کی تکمیل کے بعد ایک حاکم کے سپرد تھا، جس کا صدر مقام قیروان تھا۔ یہ امراء اکثر تبدیل ہوتے رہتے تھے۔ اندلس کے ماتحت امراء بہرحال تقریباً خود مختارانہ حیثیت رکھتے تھے۔ یہ حاکم پہلے تو اشبیلیہ میں رہتے تھے، اور پھر انھوں نے قرطبہ کو نظم ونسق کا مرکز منتخب کیا۔ وہی قرطبہ جو صدیوں تک مغربی خلفاء کا عظیم الشان دارالخلافہ رہنے والا تھا۔ مشرقی خلافت سے الگ ہونے، اور اس کے بعد بھی صدیوں تک، اندلس کی قسمت بربریوں سے وابستہ رہی۔ یہ قوم آبنائے جبل الطارق کے دونوں کناروں پر آباد تھی، اور دونوں ملکوں کا تعلق اس قوم کی وجہ سے قائم تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جب کبھی شمال افریقہ میں بربریوں کا فساد برپا ہوا تو اندلس بھی اس کے مہلک اثرات سے نہ بچ سکا۔ دونوں ملکوں میں فرق اتنا تھا کہ شمالی افریقہ میں بربری مفتوح تھے، جو اسلام قبول کرلینے کے بعد عربوں سے مساوی سلوک کے خواہاں اور دعویدار تھے، اس کے برعکس اندلس میں عربوں اور بربریوں نے مل کر ایک نیا ملک فتح کیا تھا، اور اس ملک کے اراضی اور محاصل دونوں آپس میں تقسیم کرلئے تھے۔ عربوں نے اندلس میں ایک نہایت ہی زبردست غلطی یہ کی کہ انھوں نے پرانے رئیسوں اور حکمرانوں کو ایک قلم برطرف کردیا۔ شمالی افریقہ میں بربریوں کو اس قدر تکلیف اور مصیبت اٹھا کر فتح کرنے کے بعد انھوں نے ان کے ساتھ نہایت متکبرانہ سلوک روا رکھا، اور دوسری طرف اندلس میں انھیں مساوی سمجھ کر مال غنیمت کا حصہ دار بنالیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرقہ بندی کے تمام اسباب خود بخود پیدا ہوگئے۔ منوزہ نامی ایک بربری نے شمالی اندلس میں اپنی خود مختاری کا اعلان کرکے اپنے آپ کو صوبے کی حکومت سے بالکل الگ کرلیا، اور ڈیوک ایودو سے دوستی کرنے کے علاوہ اس سے مصاہرت کے تعلقات بھی پیدا کرلئے۔ لیکن اس کے اعلان خود مختاری سے اس کے ہم وطن متاثر نہ ہوئے، اور اسے آسانی کے ساتھ ۷۲۹ء یا ۷۳۰ء میں زیر کرلیا گیا۔

دریں اثنا افریقہ میں اور زیادہ اہم واقعات رونما ہونے والے تھے۔ یہ خلیفہ ہشام کا

زمانہ تھا، جب کہ رفتہ رفتہ حضرت عمرؓ کا قائم کردہ نظام ٹوٹ رہا تھا، اور سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ اس نظام میں ایک عام تبدیلی کی جائے، اسی کے پہلو بہ پہلو دفتری حکومت اور ایشیائی مطلق العنانی تھی۔ جو کسی طرح بھی ان کوہستانی باشندوں یعنی بربریوں کے لائق طبع نہ تھی، انھیں صرف تدبر اور مال غنیمت کی امید پر مطیع و فرماں بردار رکھا جاسکتا تھا۔ جس طرح عام طور پر تمام ایشیائی اقوام، اور خصوصاً بربریوں میں، ہر قومی یا معاشی مخالفت مذہبی رنگ اختیار کرلیتی ہے، اسی طرح اس موقع پر بھی ہوا۔ ہم اس سے قبل کہیں خارجیوں کا ذکر کر چکے ہیں، جو جنگ صفین کے بعد حضرت علیؓ سے الگ ہو گئے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ فاسق یا غیر متقی خلیفہ یا امام کو کسی وقت برطرف کرنے میں عوام حق بجانب ہیں۔ اس سے پہلے ہم اس طرف بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ بنی امیہ کو ان کی طرف سے سخت پریشانی اٹھانی پڑی تھی۔ خارجیت کے عقائد اس وجہ سے اور بھی اہمیت رکھتے تھے کہ وہ درحقیقت قدیم عربی آزادی کا ایک رُخ پیش کرتے ہیں، جو مطلق العنان اور دفتری حکومت کے خلاف بعینہ ویسے ہی ظاہر ہوا تھا، جیسے کہ ایرانیوں نے شیعیت کو اپنی مخالفت کا مرکز بنا لیا تھا۔ شمالی افریقہ میں جوں جوں بنی امیہ کی فوج اور بربری آبادی میں ناموافقت بڑھتی گئی، خارجی عقائد بربریوں سے زیادہ ہردلعزیز ہوتے اور پھیلتے گئے اب چونکہ عرب اپنے قبائلی عناد و فساد کی وجہ سے دشمن سے لڑنے اور اُسے زیر کرنے کی ہمت کھو بیٹھے تھے، اس لئے خلیفہ ہشام کے زمانے میں بربری اکثر و بیشتر قابو سے باہر ہونے جا رہے تھے۔ مقامی شورشوں کو بآسانی فرو کر دیا جاتا تھا، لیکن ایک زبردست شورش بعید ترین مغربی علاقوں میں شروع ہوئی۔ آج کل جس علاقے کو مراکو (مَرّاکش) کہتے ہیں وہاں سے باشندوں نے ۱۲۲ھ میں نہایت قلیل مدت کے اندر عربی حکومت کا جوا کندھے سے اتار کر پھینک دیا۔ خلیفہ ہشام نے ایک زبردست فوج جو ہشام کی بہترین فوجوں سے جمع کی گئی تھی، افریقہ بھیجی اور حکم دیا کہ وہ مقامی فوج کے ساتھ اتحاد عمل کریں۔ لیکن عربوں کی اندرونی مخالفتیں اس نازک موقع پر بھی برابر اپنا کام کر رہی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بربریوں نے نہر سیبو کے کنارے ۱۲۳ھ میں ایک

زبردست فتح حاصل کی، جس سے افریقہ میں عربوں کی سیاسی سیادت کو خطرہ پیش آیا۔ بے شمار بقیۃ السیف سپاہی اس کے بعد اندلس چلے گئے، اور انھوں نے اس ملک کی مشکلات اور ابتری میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ وہاں ان کی وجہ سے عام حالات میں بے انتہا ابتری پھیلی۔ لیکن افریقہ کی طرح یہاں بھی بنی امیہ کی حکومت کچھ عرصے کے لئے برقرار رہ گئی۔ نئے حاکم افریقہ حنظلہ بن صفوان نے چاہا کہ پرانا طریقہ اختیار کر کے ایک متحدہ محاذ قائم کرے اور ایک ہی حملے میں بربروں کی مخالفت کا خاتمہ کر دے۔ اس نے ۷۴۲ء میں قیروان سے ذرا دور اصنام[1] (؟) کے مقام پر بربریوں کی عام فوج کو ایک بڑی شکست دی۔ اس کے نائب ابو الخطار، امیر اندلس نے بھی اپنے ملک میں امن و امان قائم کیا۔ بربری مخالفت کی کمر ٹوٹ چکی تھی، لیکن اس کے ساتھ ہی شمالی افریقہ کی آئندہ قسمت بربریوں کے ہاتھ میں تھی نہ کہ عربوں کے، اور وہی اس کے متعلق آخری فیصلہ کرنے والے قرار پائے تھے۔ اس کے علاوہ بربریوں کی ایک زبردست تعداد اصلی اسلام سے منحرف تھی؛ چنانچہ آج کے دن تک شمالی افریقہ کے اکثر باشندے خارجیوں کے فرقۂ اباضیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

یہ امن و امان صرف تین برس تک رہا۔ ۷۴۹ء میں تمام سلطنت کی طرح شمالی افریقہ اور اندلس میں بھی بد امنی کا دور دورہ شروع ہوا۔ اس کا انجام بنی امیہ کی مکمل تباہی پر ہوا۔ ان انتشارات سے نجات پا کر اندلس ایک خود مختار سلطنت بن گیا، اور ترقی کی راہ پر گامزن ہوا۔ اس کے علاوہ شمالی افریقہ میں بھی متعدد خود مختار حکومتیں قائم ہوئیں۔ جب دار الخلافہ شام سے منتقل ہو کر عراق میں آ گیا تو بحیرۂ روم کے ساحلی علاقوں کے باشندوں میں خود مختاری کی ایک لہر دوڑ گئی، اور وہ سب حکومت خود اختیاری کے طالب ہوئے۔ بنی امیہ کی تباہی کے بعد وہ ممالک جنھیں عربوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے بالکل غرقاب کر دیا تھا اور جو برقہ کے مشرق میں واقع تھے، وہ محض نام کے لئے مشرقی خلافت سے وابستہ سمجھے جاتے تھے۔ سب سے پہلا

---

[1] یاقوت (معجم البلدان۔ تحت اصنام) نے اسے اندلس کا ایک شہر بتایا ہے۔ (مترجم)

غاصب اس خلافت سے محض برائے نام تعلق رکھنا چاہتا تھا۔ ۷۴۵ء میں عبد الرحمٰن بن حبیب الفہری نے تونس میں اعلان کیا کہ وہ خلیفہ کے مقرر کردہ حاکم حنظلہ بن صفوان سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ یہ حنظلہ بن صفوان وہی تھا جس نے بربریوں کی شورش کے زمانے میں مغرب کی قسمت کا فیصلہ کیا تھا۔ عبد الرحمٰن بن حبیب ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو مدتوں سے افریقہ میں بس گیا تھا' اور اس لئے اس کا خیال تھا کہ ایسا خاندان جو اپنے آپ کو افریقی کہہ سکے اس ابتری کے زمانہ میں عوام میں زیادہ ہر دلعزیز ہو سکتا ہے' اور ان سے ہمدردی کی امید بھی رکھ سکتا ہے۔ حیلے حوالے سے اُس نے حنظلہ کو مجبور کیا کہ وہ افریقہ سے چلا جائے۔ بنی امیہ کے آخری خلیفہ مروان نے اس کے بعد عبد الرحمٰن کو' جو واقعتہً اب افریقہ کا حاکم تھا' قانوناً بھی حاکم تسلیم کر لیا۔ اب عبد الرحمٰن ایک معمولی سی رقم بطور خراج ادا کرتا تھا' اور خلیفہ کا نام خطبوں میں لیتا تھا' مگر اس سے قطع نظر وہ بالکل خود مختار تھا۔ مشرق میں خاندان خلافت میں تبدیلی ہوئی تب بھی عبد الرحمٰن کی اس حیثیت میں کوئی فرق نہ آیا۔ جب عباسی خلافت بغداد میں مستحکم ہو چکی' اور وہاں سے افریقہ کی طرف زیادہ توجہ ہونے لگی' تو عبد الرحمٰن نے خلافت عباسیہ کو تسلیم کر لیا' اور بنی امیہ کے مفرور اہل خاندان کو افریقہ میں نہایت عزت کی جگہ دی (۷۵۴ء۔ ۷۵۵ء) لیکن ان امویوں کی وجہ سے خود عبد الرحمٰن کے خاندان میں پھوٹ پڑی' جس کا انجام یہ ہوا کہ وہ خود اور اُس کے علاوہ دو اموی موت کے گھاٹ اُتارے گئے۔ ایک تیسرا شہزادہ عبد الرحمٰن بن معاویہ بن ہشام کسی نہ کسی طرح اندلس پہنچا اور مغربی خلافت کا بانی ہوا۔ افریقہ میں عبد الرحمٰن بن حبیب کے قتل سے بدنظمی پھیلی' اور لامرکزیت کی طرف رجحان بڑھنے لگا۔ بعید ترین مغربی علاقوں میں خود مختار بربری حکمران خاندان پیدا ہوئے۔ ۷۵۷ء میں سجلماسہ میں بنی مدرار اور ۷۶۱ء میں تاھرت کے مقام پر بنی رُستم خود مختار ہو گئے۔ موخر الذکر خارجی عقائد کے پابند تھے۔ قریب تر مغربی علاقوں میں عربوں اور ان بربریوں میں جو مختلف فرقوں میں منقسم ہو گئے تھے' قیروان پر قبضہ کرنے کے لئے کوششیں شروع ہوئیں۔ اس شہر کے باشندوں نے

۷۷۶ء میں تھوڑی مدت کے لئے عباسی خلافت سے وابستہ ہونے کا اعلان کیا۔ الجزائر کے قرب وجوار میں طرح طرح کی بدامنی اور انتشار نے اپنا گھر بنا لیا، اور اب افریقہ کا ایک نیا صوبہ قائم ہوا، لیکن مغرب اقصےٰ ہمیشہ کے لئے قبضے سے نکل چکا تھا۔

یہیں مغرب اقصےٰ میں بہت جلد ایک تیسری سلطنت قائم ہوئی۔ بنو علی میں سے ادریس عباسیوں سے شکست کھا کر بھاگے، بالآخر ۷۸۸ء میں موجودہ زمانے کے علاقہ مراکو میں پہنچے اور وہاں ایک خودمختار سلطنت قائم کرلی۔ یہ سلطنت بہت جلد موجودہ تلمسان تک وسیع ہوگئی۔ یہیں ایک لائق اور سمجھدار لیڈر نے مذہبی عقائد کے تحت بربری اتحاد پیدا کیا۔ مغرب میں ادریسی حکومت سب سے پہلی شیعی حکومت تھی۔

مغرب کے وسیع صوبے میں آٹھویں صدی عیسوی کے عشر آخر میں ایک اور خودمختار سلطنت قائم ہوگئی۔ عرب سپہ سالاروں اور قبائل کے تنازعات اب اس حد تک پہنچ گئے تھے کہ بغداد کے مقرر کردہ حاکم ان تنازعات کو کسی طرح قابو میں نہ لاسکتے تھے۔ افریقہ میں مزاب (؟) کا ایک نائب حاکم ابراہیم بن اغلب تھا (مزاب الجزائر کے ساحل بحر کے عقب میں واقع ہے)۔ ابراہیم کے باپ نے مزاب کو دوبارہ فتح کیا تھا۔ یہی ابراہیم بن اغلب اکیلا شخص تھا جو حکومت کے اقتدار کو دوبارہ قائم کرسکتا تھا (۸۰۰ء)۔ صرف یہی شخص اس کام کے لئے موزوں تھا، اس لئے اُس نے خلیفہ سے دعویٰ کیا کہ افریقہ کی حکومت اُس کے لئے موروثی کردی جائے، اور وہ ایک مقررہ خراج سالانہ سرکاری خزانہ میں ادا کرتا رہے گا، اس کے بدلے میں وہ خلیفہ کا نام خطبوں میں لے گا، اور اُس کا نام سکوں پر مسکوک کرائے گا۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو درحقیقت یہ پوری خودمختاری تھی، اور اس کا مطلب یہ تھا کہ اب افریقہ کا تعلق خلافت سے باقی نہیں رہا۔ اس طرح قیروان میں بنی اغلب کا حکمران خاندان قائم ہوا، جس نے افریقہ کو اکثر لائق وقابل، اور بعض ناقابل ذکر، حکمران دئے۔ انھیں لائق حکمرانوں کی بدولت اس چھوٹی سی سلطنت نے افریقہ میں ایک قابل ذکر جنگی بیڑا بھی بنا لیا، جو بہت جلد

وسطی یورپ میں اسلامی توسیع سلطنت کا ایک آلہ بن گیا۔ انھیں بنی اغلب کے تحت صقلیہ فتح ہوا۔
لیکن قبل اس کے کہ ہم اس واقع کی تفصیل کریں، ہم شمالی افریقہ کی تاریخ کا ایک خاکہ، جہاں تک کہ اُس کا تعلق جنوبی یورپ میں اسلام کی توسیع سے ہے، پیش کرتے ہیں۔ باوجود اپنی ظاہری شان و شوکت اور استحکام کے افریقہ میں بنی اغلب کی حکومت کی بنیادیں بہت کمزور تھیں۔ صقلیہ کی طرف ایسے سپہ سالاروں کا رُخ بدل دینے سے، جن کی سرشت میں سرکشی اور شورہ پشتی داخل ہو چکی تھی، بنی اغلب کو کافی مدت تک آرام اور چین نصیب ہو گیا۔ سو برس قائم رہنے کے بعد بھی ان کی حکومت آخر کسی بیرونی دشمن کا شکار نہیں ہوئی، بلکہ اندرونی ملک میں ہی بربری قبائل کی سیاسی بدنظمی اور خود حکمران خاندان کے افراد کے خون ریز مناقشات نے اس سلطنت کو تباہ کر دیا۔

ان حالات سے شیعی مخالفوں نے فائدہ اُٹھایا۔ یہ مخالف فریقین ایشیا میں متعدد مرتبہ نقصان اٹھانے اور زکیں کھانے کے بعد آخر افریقہ کی طرف متوجہ ہوا، جہاں اس سے قبل ہی اور سیوں کی وجہ سے زمین تیار ہو چکی تھی، اور لوگ اس تحریک سے کافی واقف تھے۔ لیکن اس صورت میں یہ تحریک افریقہ کے لئے نئی تھی، اور اس کا رہنما عبید اللہ نامی ایک شخص تھا۔ اس کا بنو علی سے ہونا بڑی حد تک مشتبہ ہے، لیکن اس خاندان کو حضرت فاطمہ کے نام پر فاطمین کہتے ہیں۔ جب عبید اللہ نے ۹۰۹ء میں حالات سے فائدہ اٹھا کر، اور ایک قابل داعی سے مدد لے کر، افریقہ پر قابو حاصل کر لیا، تو اُس نے مہدی کا لقب اختیار کیا، جو بنو علی کا بڑا پرانا دعویٰ تھا، اور جو اس کی شخصیت میں جا کر پورا ہوا۔ مہدی نے ایک نیا شہر مہدیہ آباد کیا، اور ایک سلطنت کی بنیاد ڈالی، جو چند صدی تک بحیرۂ روم کے مشرقی حصے پر حکومت کرتی رہی؛ مگر سمندر کے اس قبضے سے مصر کا قبضہ بھی وابستہ تھا، اور مصر عبید اللہ المہدی کے تیسرے جانشین معز کے عہد میں ۹۶۹ء میں انھیں حاصل ہوا۔ خلیفہ معز ہی موجودہ قاہرہ کا بانی ہے۔ خلافت فاطمین کی سب سے زیادہ اہمیت مشرق میں تھی، جہاں انھوں نے شام بھی فتح

کر دیا تھا۔ افریقہ اب فاطمین کے ایک نائب کے سپرد کر دیا گیا۔ یہ یوسف بلکین بربری قبیلہ صنہاجہ سے تعلق رکھتا تھا، اور جلد ہی خلفاء فاطمین سے تقریباً خود مختار ہو گیا تھا۔ یوسف نے خاندان زیری کی بنا ڈالی جو ۹۷۲ء سے ۱۱۴۸ء تک بر سر حکومت رہا۔ اس کے پہلو بہ پہلو ۱۰۰۷ء سے ۱۱۵۲ء تک الجزائر میں بنی حماد بر سر اقتدار رہے۔ مراکو میں اور لیبیہ کی سلطنت اس دوران میں چھوٹے چھوٹے حصوں میں منقسم ہو گئی تھی۔ مشرق کے مالک فاطمین ہی رہے، اور ان کے زیر حکومت مصر کو انتہائی عروج حاصل ہوا، اس ملک کی تاریخ میں یہی بد ترین عہد بھی تھا۔ خلافت فاطمین کا وارث ۱۱۷۱ء میں سلطان صلاح الدین ایوبی ہوا۔

اب ضروری ہے کہ صلیبی لڑائیوں کے آغاز تک ہم افریقہ کی تاریخ پر ایک نظر ڈال لیں، تاکہ صقلیہ اور جنوبی اطالیہ میں ہم اسلامی حملوں کی تاریخ پر کما حقہ غور کر سکیں۔ خشکی کے خاص خاص تاریخی واقعات کے نقطۂ نظر سے وسطی یورپ پر مسلمانوں کے ان حملوں سے تاریخ عالم میں ایک تسلسل پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ حملے ایک ہی تحریک کی مختلف کڑیاں ہیں، جو قدرتی طور پر صقلیہ کے مکمل، اور بر اعظم یورپ کے ایک حصے کی فتح پر جا کر ختم ہوئیں۔ جیسا کہ اندلس میں ہو چکا تھا اسلامی عمل کے ساتھ ساتھ مسیحی دنیا میں بھی ایک ردعمل شروع ہوا۔ جوں جوں مسلمان آگے بڑھتے گئے، وہ رفتہ رفتہ اپنے پرانے مقبوضات سے بے دخل کئے گئے۔ یہاں ہم ردعمل سے قطع نظر کر کے صرف عمل کا ذکر کرینگے، اور جب یہ دیکھ لیں گے کہ صقلیہ اور اطالیہ میں بعض اتفاقات کی وجہ سے، یہ عمل اندلس اور ایشیائے کوچک کے مقابلے میں جلدی ختم ہو گیا، تو پھر ہم اس پر غور کرینگے کہ عربوں کی عام توسیع سے اس کا تعلق کس حد تک ہے۔ صقلیہ کی فتح ہر حالت میں افریقہ کے قبضے سے تعلق رکھتی ہے، اور جوں ہی وہاں کے حالات مساعدت کرتے افریقہ کی فتح کا لازمی نتیجہ صقلیہ کی فتح ہوتا۔ یہ بالکل وہی تحریک ہے جس نے آبنائے جبل الطارق کے راستے سے عربوں کو اندلس پہنچایا تھا۔ اس کے بعد مشرقی یورپ پر اسلامی دنیا کی یورش، اور قسطنطنیہ کی فتح، جو عثمانی ترکوں کے ہاتھوں ہوئی، وہ سب اُس اصلی اور حقیقی تحریک کا ایک

جزو ہیں جس کا ذکر ہم یہاں کر رہے ہیں، مگر ان واقعات کو عربی تحریک سے کوئی تعلق نہیں آئندہ جو کچھ ہم بیان کرینگے وہ عربی تحریک توسیع کے آخری واقعات ہیں۔

صقلیہ کے اسلامی قبضے اور وہاں کی اسلامی تاریخ کے مستند مورخ اماری[1] نے لکھا ہے کہ اگر ناظرین دنیا کے نقشے پر ایک سرسری نظر بھی ڈالیں تو انھیں اندازہ ہو جائے گا کہ افریقہ کی فتح کے بعد صقلیہ پر شرقیین کا حملہ ہونے ہی والا تھا، اور کوئی واقعہ اُسے ان جنگوں سے نہیں بچا سکتا تھا۔ اس جلیل القدر مصنف نے لکھا ہے کہ صقلیہ کے خلاف جو بحری مہیں مسلمانوں نے بھیجی تھیں اُن کا نقطۂ آغاز افریقہ نہیں تھا، بلکہ شام تھا۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ یہ اُس وقت ہوا جب امیر معاویہ، جو بعد میں خلیفہ ہوئے، شام کے حاکم تھے۔ اس واقعے کے متعلق بہت سی متضاد روائتیں ملتی ہیں، جن سے کسی بات کا پتہ لگانا مشکل ہے۔ بہرحال یہ ضرور ہے کہ عربوں کا جنگی بیڑا سب سے پہلے امیر معاویہ کی خلافت میں صقلیہ پہنچا، اور افریقہ میں ان کے مقرر کردہ حاکم معاویہ بن حُدَیج نے بازنطینیوں کے خلاف اس موقع پر خلیفہ سے تعاون کیا تھا۔ یہ ۶۶۴ء کا واقعہ ہے۔ ابن حُدیج کے ساتھ بہت سی عربی روایات وابستہ ہیں۔ غالباً ابن حُدیج صقلیہ کبھی نہیں گیا تھا، بلکہ اُس کا نمائندہ عبداللہ بن قیس بیڑے کا افسر تھا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ قابل وثوق بات یہ ہے کہ یہ بحری مہم شام سے آئی ہی نہیں تھی، بلکہ اس کا مرکز پنتاپوس یعنی برقہ تھا، اور وہیں سے یہ بھیجی گئی تھی۔ کیونکہ شامی بیڑے کو قریب کے علاقے میں مال غنیمت حاصل کرنے کے موقعے حاصل تھے۔ لیکن برقہ کے متعلق ہمیں قافیروں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مقام ساتویں صدی عیسوی میں ایک زبردست بحری مرکز تھا، جہاں سے مغرب کی طرف جانے والے بیڑے مصر کے نو قائم شدہ بحری مرکز کے ساتھ تعاون کیا کرتے تھے۔ اس مقصد کے لئے بعد کے زمانے میں جن بیڑوں اور مہموں کا ذکر آتا ہے وہ یہیں سے بھیجے جاتے تھے، خاص خاص موقعوں کی تلاش میں رہتے تھے، اور عربوں اور بازنطینیوں کی مسلسل لڑائیوں میں صائفہ کے

---

[1] Amari

موقعوں پر بھی جنگوں میں حصہ لیتے تھے۔ یہ فوجی مہمیں بحری یا بری دونوں طرح کی ہوتی تھیں۔ آخری زمانے میں، جب کہ عظیم الشان اسلامی سلطنت تباہ ہو کر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گئی تھی، انھیں صائفہ نے بحری قزاقی کی صورت اختیار کی، جو رفتہ رفتہ بحیرۂ روم کے لئے ایک وبا بن گئی، اور جنھیں کورسر کا نام دے دیا گیا۔ اسی طرح بحری قزاقی کی ایک مہم معاویہ بن حُدَیج کی بھی تھی، جو صقلیہ کے خلاف بھیجی گئی تھی۔ اس مہم میں جو مال غنیمت حاصل ہوا وہ قیدی عورتوں اور کلیساؤں کے خزانوں کی صورت میں تھا۔ انھیں خزانوں کو عرب مورخ "اصنام" کہتے ہیں۔ جس قدر جلد ممکن ہوا معاویہ بن حُدَیج نے انھیں سکّوں کی صورت میں تبدیل کر دیا۔

اس واقعہ سے معلوم ہو گا کہ مسلمانوں کے شمالی افریقہ پر قبضے کے ساتھ ہی صقلیہ کے خلاف مہمیں بھیجی جانے لگیں تھیں۔ ان دونوں واقعات میں بہت نزدیک کا تعلق ہے۔ اسی طرح آئندہ دس سال میں جو متعدد مہمیں زیادہ مکمل تیاریوں کے ساتھ بھیجی گئیں، وہ مغربی معرکہائے جنگ سے متعلق تھیں۔ اس لئے اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیئے کہ دو افسر، حسان بن نعمان اور موسیٰ بن نُصیر، جنھوں نے بربریوں میں امن پیدا کرنے کی سب سے زیادہ کوشش کی، وہ لوگ تھے جنھوں نے صقلیہ پر حملے کرنا اپنا معمول بنا لیا تھا۔ اس طرح وہ چھوٹے چھوٹے جزیرے جو پنتالیریا کہلاتے تھے، اور افریقہ اور صقلیہ کے درمیان واقع تھے عربوں کے لئے محض گودی کا کام دیتے تھے۔ ان پر عربوں نے قبضہ کر لیا تھا اور سردانیہ کو لوٹا اور پامال کیا تھا۔ ان بے شمار مہموں کا ذکر کرنا جو بحیرۂ روم کے جزائر کے خلاف مختلف اوقات میں بھیجی گئی تھیں، ہمارے لئے بے کار ہو گا۔ یہ یورشیں ساحل کے باشندوں کے لئے مصیبت بن گئی تھیں لیکن ان سے بہت ہی کم فائدہ حاصل ہوتا تھا۔ بہر حال معلوم ہوتا ہے کہ صقلیہ کی حفاظت اور قلعبندی خوب اچھی طرح کی گئی تھی۔ ایک مرتبہ خود سرقوسہ کے قلعے پر عبد الرحمٰن بن حبیب، حاکم افریقہ، نے اس صوبے میں اپنی حکومت مستحکم کرنے کے بعد ۷۵۲ء میں حملہ کیا۔ لیکن سرقوسہ کے باشندوں نے خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا، اور اسی وعدہ کی بنا پر عبد الرحمٰن واپس چلا گیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شہر

کس قدر استحکام کے ساتھ قلعبند کیا گیا تھا کہ عبدالرحمٰن اُسے فتح نہ کر سکا، حالانکہ وہ صقلیہ کو فتح کرنے کے ارادے سے آیا تھا۔ آٹھویں صدی کے نصف آخر میں صقلیہ کو افریقی دشمنوں سے ایک حد تک نجات مل گئی، کیونکہ اس زمانے میں خود شمالی افریقہ میں انتشار پھیلا ہوا تھا۔

اس کے بعد بنی اغلب نے جب وہاں پورا امن و امان قائم کر دیا، اور حکومت کو استحکام حاصل ہوا، تو نئے سرے سے صقلیہ کے خلاف فوجکشی شروع ہوئی۔ لیکن ان بحری مہموں میں صرف بنی اغلب ہی نے حصہ نہیں لیا، بلکہ اوریبیہ، یہاں تک کہ اندلس کے مسلمان بھی اس میں شریک تھے۔ جب کبھی کسی سلطنت کو موقع ملتا تھا تو وہ دوسروں سے مل جاتی تھی، اور سب متحد ہو کر حملہ کرتے تھے۔ اگر اہل صقلیہ خوش قسمتی سے بنو اغلب کے ساتھ دوستانہ معاہدہ کر لیتے، اور یہ سمجھ لیتے کہ کچھ مدت کے لئے انھیں چین نصیب ہو جائے گا تو اچانک اوریبیہ کے جہاز ان کے ساحل پر ظاہر ہوتے اور پھر وہی تاخت و تاراج شروع ہو جاتی۔ یہ مہمیں ایک بڑی حد تک ایک دوسرے سے وابستہ تھیں اور درحقیقت اندلس کے بنو امیہ اور سلطنت افرنجہ کی مسلسل جنگوں کا ایک حصہ تھیں۔ لیکن ان میں اکثر یورشیں ایسی تھیں جن کے متعلق فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ ان کا تعلق کس خاص اسلامی سلطنت سے تھا۔ خاص طور پر ۸۱۳ء کی ایک مہم قابل ذکر ہے، کیونکہ یہ مہم شمال تک بڑھتی چلی گئی تھی اور نِزّا[1] اور سوتیا وخیا[2] تک پہنچی تھی۔ اسی سال، یا اس کے بہت جلد بعد ریگیو پر بھی پہلا اسلامی حملہ ہوا۔ کارسیکا کا حال سب سے زیادہ خراب تھا۔ سردانیہ والے اپنی حفاظت بہتر طریقے سے کر سکتے تھے۔ یہی حال باقی چھوٹے چھوٹے جزیروں، مثلاً پونزا اور ایشیا کا تھا۔ (۷ء سے ۱۲ اگست ۸۱۲ء) جن پر وقتاً فوقتاً حملہ ہوا۔ جلدی ہی یہ جزیرے مسلمانوں کے حملوں کے مرکز بن گئے۔ لیکن اب بھی ان حملوں سے کوئی بڑے اہم نتائج حاصل نہیں ہوتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اول تو یورشوں کا یہ سیلاب صرف ساحل بحر تک محدود رہتا تھا، اور دوسرے بازنطینی حکومت

---

[2] Civita Vecchia

[1] Nizza

اور چارلس اعظم بھی غافل نہیں تھے اور اپنی اپنی سلطنتوں کی حفاظت کا انتظام کر رہے تھے۔ عام طور پر یہ دونوں سلطنتیں اپنی تمام کوششیں محض مدافعت تک محدود رکھتی تھیں۔ ان کا کام صرف یہ تھا کہ ترکی بہ ترکی جواب دیتی رہیں۔ انھوں نے کبھی شمالی افریقہ کے خلاف ایک قزاقانہ مہم بھیجی تھی۔ مگر یہ صرف ایک مرتبہ ہوا جب ٹسکنی کے کاونٹ بونی فیس کے ماتحت ایک قزاخانہ مہم نے بونیکا اور قرطاجنہ کے درمیان شمالی افریقہ کے ساحل کو چھوٹے چھوٹے افرنجی بیڑوں کے ذریعے سے لوٹا اور اس ساحل کے لئے آفت جان بن گئے۔

۸۲۷ء میں یورپ کی سرزمین پر مسلمانوں کا سب سے پہلا قابل ذکر حملہ ہوا، جس سے اہم نتائج برآمد ہوئے۔ لیکن یہ حملہ بھی اسلامی جدوجہد کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ اس موقع پر بنو اغلب ایک مسیحی باغی کی مدد کر رہے تھے، اور اسی مدد کے دوران میں انھوں نے صقلیہ کے زرخیز جزیرے کو فتح کیا۔ اس طرح اطالیہ کے بالکل پڑوس میں مسلمانوں کی ایک فوجی چوکی قائم ہوگئی، اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اُس انتشار میں جو اس وقت وسطی اور جنوبی اطالیہ کی ریاستوں میں پھیلا ہوا تھا مسلمان سیاسی لحاظ سے ایک اہم عنصر بن گئے، اور اطالیہ کی سیاست میں انھیں دخل دینے کا موقع مل گیا۔

صقلیہ پر بنو اغلب کے اس حملے کا اصل موقع ایک فوجی بغاوت تھی۔ یہ انھیں بغاوتوں کا ایک سلسلہ تھی جو صقلیہ میں بازنطینی فوجوں کی طرف سے آئے دن ہوتی رہتی تھیں۔ اس موقع کے خاص حالات کی تفصیل پوری طرح معلوم نہیں لیکن ہمیں اماری کی تحقیقات پر یقین کر لینا چاہئے کہ اس وقت غداری کا سرغنہ فیمی تھا، جو اپنے منصوبوں میں ناکام ہونے کے بعد بازنطینی حاکم صقلیہ فوتے نوس کے خوف سے بھاگا، اور صقلیہ سے نکل کر سیدھا افریقہ میں زیادۃ اللہ کے پاس پہنچا، جو بنو اغلب کا تیسرا حکمران تھا۔ فیمی اُس سے مدد کا طالب ہوا، اور اس سے یہ وعدہ لیا کہ صقلیہ کی فتح کے بعد اُسے وہاں کا باجگزار حاکم مقرر کر دیا جائے گا۔ زیادۃ اللہ نے اپنے قاضیٔ ہفتاد سالہ، اسد بن فُرات سے، جو افریقہ کے فقہا میں سب سے زیادہ سربرآوردہ سمجھے جاتے تھے، اور بنو اغلب کی سیاسیات پر حاوی تھے، اس معاملے میں مشورہ کیا۔ انھیں کو زیادۃ اللہ نے

صقلیہ کی اس مہم کا سپہ سالار بھی بنا دیا۔ اسد بن فرات نے بھی اس تقرر کو خوشی خوشی منظور کر لیا، کیوں کہ کوئی مسلمان اس جزیرے کے خلاف جہاد میں حصہ لینے میں تامل ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ زیادۃ اللہ کے لئے یہ واقعات عین موقع پر پیش آئے تھے۔ کیونکہ ان کی وجہ سے اُسے یہ موقع ملا کہ عرب اور بربری قبائل کو، جن میں ضبط و تنظیم کسی حالت میں پیدا ہو ہی نہیں سکتی تھی، کچھ مدت کے لئے دوسرے کاموں میں مصروف کر دے۔

سن رسیدہ قاضی، اسد بن فُرات نے بذات خود فوج کی سرکردگی کی۔ اس فوج تعداد گیارہ ہزار تھی، اور مزارہ کے مقام پر وہ صقلیہ میں اتری۔ فوتے نوس کو شکست ہوئی، اور اسلامی فوج سرقوسہ کے قلعبند شہر تک بڑھتی چلی گئی۔ لیکن یہاں سے پس پائی شروع ہوئی۔ سرقوسہ ناممکن التسخیر ثابت ہوا، ایک وبا نے محاصرین کا خاتمہ کرنا شروع کیا، اور خود اسد بن فرات بھی اسی وبا کی نظر ہوے۔ فیمی قتل ہوا، قسطنطنیہ سے تازہ دم فوجیں صقلیہ کی مدد کے لئے آ گئیں، اور دوسرے طرف زیادۃ اللہ افریقہ کے فسادوں میں ایسا مصروف ہوا کہ وہ امدادی فوجیں نہ بھیج سکا۔ اس لئے مجبوراً اہل فریقہ کو مزارہ اور مینو سے واپس ہونا پڑا، اور عین اس وقت جب مسلمانوں کے جوش و خروش سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ جزیرے کو فتح کئے بغیر دم نہ لینگے، ان کے تمام منصوبوں پر پانی پھر گیا۔ لیکن اہل افریقہ کی جگہ اہل اندلس نے لی (۸۲۹ء)، اور اب تاریخ کا ایک ورق الٹ گیا۔ ۸۳۱ء میں افریقہ کی تازہ دم فوجوں نے بلرم (پالرمو) فتح کیا اسی زمانے میں اسلامی مقبوضات براعظم یورپ تک پہنچے، جس کا ذکر آئندہ آئے گا۔ قدم بقدم بازنطینیوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ یہ جنگیں کم و بیش دس سال تک جاری رہیں۔ یہاں تک کہ ۸۴۳ء میں ایک اغلبی شہزادہ ابو اغلب ابراہیم کی سرکردگی میں ایک فوج نے مسینا فتح کر لیا۔ اس وقت بازنطینی کوئی مدد صقلیہ کی نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ ان کی تمام فوجیں مشرق میں مصروف پیکار تھیں۔ لیکن ابھی تک وہ جزیرے کے بعض مقامات پر قابض تھے۔ کستروگوینی کا قلعہ ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے، اور بظاہر ناقابل تسخیر معلوم ہوتا ہے۔ آج بھی اسے دیکھنے سے اندازہ

ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں اس کی فوجی اہمیت کس قدر ہوگی۔ لیکن یہ قلعہ بھی ایک طویل مزاحمت کے بعد ابو اغلب ابراہیم کے جانشین فضل بن عباس کے ہاتھ پر فتح ہوگیا۔ اس کے بعد غیر منظم افریقی سپاہیوں کی تندہی اور جفاکشی زیادہ دن تک باقی نہیں رہی۔ قبل اس کے کہ جزیرہ کی فتح مکمل ہو عربوں اور بربریوں میں تنازعات شروع ہوگئے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھیں وجوہ سے، جن کی بنا پر جنوبی افریقی سلطنت میں مسلمانوں کی ترقی رک گئی تھی، جزیرۂ صقلیہ کی فتح بھی رکتی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن بنو اغلب کا آخری جفاکش اور قابل لحاظ حکمران ابراہیم ثانی افریقہ کی تمام مشکلات پر غالب آیا، اور اُسی کے زمانے میں ۲۱ مئی ۸۷۸ء کو سرقوسہ کی فتح اور اس کا انہدام عمل میں آیا۔ اس کے بعد ابراہیم صقلیہ آیا، اور یہاں آکر اُس نے اٹنا[1] کے علاقے کے تمام عیسائیوں کو جو اب تک زیر نہیں ہوئے تھے، نہایت بے رحمانہ طریقے سے زیر کیا اور ۹۰۲ء میں تورمینا کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اب صقلیہ کی فتح مکمل ہوچکی تھی۔ ۱۰۶۱ء میں پہلی مرتبہ عیسائیوں کی طرف سے اسے دوبارہ فتح کرنے کی کوششیں شروع ہوئیں۔

اسی سال ۹۰۲ء میں ابراہیم نے کوزنسا کے سامنے عین اُس وقت وفات پائی جب کہ وہ آبنائے کے پار قلبیریا[2] خلاف جہاد کا اعلان کرچکا تھا۔ وہ پہلا مسلمان نہیں تھا جس نے اطالیہ کی سرزمین پر قدم رکھا۔ کیونکہ بلرم کی فتح کے بعد ہی اغلبی سپہ سالاروں نے اس برادرانہ خانہ جنگی سے، جس میں لنگوبارڈی کی سلطنتیں اُس وقت مبتلا تھیں، فائدہ اٹھانا شروع کرلیا تھا، اور جنوبی اور وسطی اطالیہ کے لئے ایک مصیبت بن گئے تھے۔ ہر وہ شخص جس نے نیپلز اور سلرنو کے درمیانی ساحل پر سفر کیا ہے، اس نے بے شمار "شرقیین کے میناروں" کو دیکھا ہوگا جو درحقیقت ان ساحلی میناروں کے کھنڈر ہیں، جنھیں اس وجہ سے تعمیر کیا گیا تھا کہ افریقی اور صقلوی جنگی بیڑوں کی آمد کی اطلاع جلد از جلد تمام ساحل پر دی جاسکے۔ آج کل بھی اس زرخیز اور خوش حال علاقے کے باشندوں میں

---

[1] Etna

[2] Calabria

اُس زمانے کی یاد تازہ ہے جب کہ صدیوں تک اِن اسلامی حملوں نے ہر قسم کی ترقی میں رکاوٹیں پیدا کر رکھی تھیں۔ یہ علاقہ وسطی یورپ میں مسلمانوں کا آخری صدر مقام تھا۔ عرب مورخوں نے جو کچھ بیان کیا ہے اُس کی تصدیق یورپ کے اسناد سے بھی ہوتی ہے۔ چونکہ جنوبی اطالیہ میں بربریوں اور عربوں نے جو حکومتیں قائم کی تھیں ان میں کبھی استحکام پیدا انہیں ہونے پایا، اس وجہ سے ان میں وہ رجحان ہی نہیں پایا جاتا جو ایک اعلیٰ درجے کی تہذیب اور علمی ترقی کے لئے ضروری ہوا کرتا ہے

لیکن اطالیہ میں مسلمان بن بلائے نہیں آئے۔ مدتوں سے بنی ونت کا ڈیوک اس کوشش میں تھا کہ نیپلز کے آزاد شہر پر قبضہ جمائے نیپلز کا متعدد مرتبہ محاصرہ ہوا تھا، اور اس پر خراج عائد کیا گیا تھا۔ لیکن جوں ہی کہیں سے مدد مل جاتی یہاں کے باشندے یہ خراج ادا کرنے سے انکار کر دیتے۔ اہل نیپلز نے لدوگ سے بے سود التجا کی تھی کہ وہ ان کے معاملے میں دخل دے اور انھیں مصائب سے بچائے۔ جب انھیں اپنے گرد و پیش کوئی ایسی مستقل صورت نظر نہ آئی کہ وہ کسی بڑی طاقت سے اپنے آپ کو متحد کر لیں، تو وہاں کے ڈیوک اندریاس نے مجبور ہو کر صقلیہ کے مسلمانوں سے مدد مانگی۔ مسلمانوں نے اطالیہ کے اندرونی معاملات میں مداخلت کے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور فوراً راضی ہو گئے۔ ۸۳۷ء میں انھوں نے بنی ونت کے ڈیوک سکرد کو جو نیپلز کا محاصرہ کئے ہوئے تھا، مجبور کیا کہ وہ محاصرہ اٹھالے۔ سکرد بغاوت کی وجہ سے بھی مجبور ہو گیا تھا کہ واپس چلا جائے۔ مگر اہل نیپلز اور مسلمانان صقلیہ کا معاہدہ برقرار رہا، کیونکہ فریقین کو برسوں تک اپنے واحد دشمن کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کی ضرورت تھی، اور بنی ونت کی ریاست قدرتی طور پر دونوں کی دشمن تھی۔ اس لئے جب تھوڑی مدت کے بعد سکرد کی فوجیں برندزی کے سامنے نمودار ہوئیں تو اہل نیپلز کو مسلمانوں کی مدد کی پھر ضرورت ہوئی۔ برندزی کو جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ساحلی شہر نے ۸۳۶ء کے اس واقعے کا بدلہ بہت جلد لے لیا۔ کیونکہ ۸۴۳ء میں وہاں کے رہنے والوں نے مسلمانوں کو میسینا فتح کرنے میں مدد دی۔

سکرد کی موت کے بعد بنی ونت کی ریاست دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ بنی ونت ریڈیس کے

قبضے میں رہا اور سلرنو پر سیکونوف قابض ہو گیا۔ اب ان دونوں میں مسلسل جنگیں شروع ہوئیں مسلمانوں کے لئے جنوبی اطالیہ کی اس طاقتور سلطنت کی یہ تقسیم اور تباہی قدرتی طور پر بہت مبارک تھی۔ ۸۳۹ء میں سکرد کا انتقال ہوا، اور اس کے فوراً بعد مسلمانان صقلیہ دوبارہ قلبریہ کی سرزمین پر اترے، اور اپولیہ تک بڑھتے چلے گئے۔ اگرچہ باری کی فتح میں انھیں ناکامی ہوئی، لیکن ترنیت فتح ہوا اور وینس کے رہنے والے بھی، جنھوں نے بازنطینیوں کو مدد کے لئے بلایا تھا، اُسے نہ بچا سکے۔ یہ ۸۴۰ء کا واقعہ ہے۔ فاتح مسلمان ادریہ تک بڑھتے چلے گئے۔ انھوں نے اوسیرو[1] کو جو خرسو کے جزیرہ میں واقع ہے، جلا ڈالا۔ یہی حشر انکونا کا ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان وینی گس کے قرب و جوار تک پہنچ گئے تھے، تاکہ اس مقام کے تجارتی جہازوں پر قبضہ کر لیا۔ ۸۴۲ء میں اہل وینس کو ایک نئی شکست ہوئی۔ لیکن اس سے قبل (غالباً ۸۴۱ء میں) باری فتح ہوا، اور تیس برس تک مسلمانوں کا خاص فوجی صدر مقام رہا۔ ایدلخس کو اسکونولف نے اس کی ریاست سے نکال دیا تھا، اور اُس نے صقلیہ کے مسلمان حکمرانوں سے مدد مانگی۔ انھوں نے اپنا کام شروع کیا تاکہ باری سے اپنے حلیفوں کو نکال لیں۔ ریدلخس نے اس ضرورت کے وقت اپنے متمرد حلیفوں کو خوش کرنے کے لئے طرح طرح کے بدترین حیلوں سے کام لیا ہوگا۔ ایک بربری سردار خلفوّن کے تحت اسکونولف کے خلاف جنگ شروع کی لیکن ایک خون ریز جنگ کے بعد وہ وہاں سے نکال دئے گئے، جہاں انھوں نے ایک مستحکم مقام کو اور بھی زیادہ مستحکم کر لیا تھا۔ چونکہ مسلمانوں کے پاس ایک مستقل امدادی فوج موجود تھی اس لئے اسکونولف ان پر مکمل اور فیصلہ کن فتح کی امید نہیں رکھ سکتا تھا۔ لیکن اس کے برعکس، ریدلخس اس غیر فطری اتحاد کی وجہ سے خصوصاً ۸۴۲ء میں مسار کے زیر سرکردگی بنی دنت کے صدر مقام مسلمانوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن گیا تھا، جو نہایت آزادی اور بے دردی سے تمام ملک میں بلا خدشہ اور بلا مزاحمت گھومتے پھرتے تھے، اور اس بدبخت سرزمین میں دوست اور دشمن دونوں کے لئے

---

[1] Ossero

یکساں ایک آفت ہو گئے تھے۔

باوجود اس کے ریدالحس انھیں تکالیف و مصائب میں اپنے حریف پر غالب آگیا تھا۔ اب چونکہ اسکو نولف کو کسی اور طرف سے مدد کی امید نہیں رہی تھی، اس لئے اس نے بھی مسلمانوں کے ساتھ اتحاد قائم کرنے کی کوشش کی۔ مگر صقلیہ کے بجائے اُس نے اندلس کا رُخ کیا اس کی وجہ سے جو بے شمار یورشیں مسلمانوں کی طرف سے پرووانس، شمالی اطالیہ، بلکہ سوئزرستان پر ہوئیں ان سے ہمارا یہاں کوئی تعلق نہیں۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اسکو نولف اپنی ان امدادی فوجوں کو براہِ راست اندلس سے نہیں لایا تھا، بلکہ یہ فوجیں اقریطش سے آئی تھیں، جہاں ۸۲۶ھ میں اندلسی مسلمانوں نے، جو اپنے ملک سے بغاوت اور شورش کی بناء پر نکال دئے گئے تھے، ایک سلطنت قائم کرلی تھی۔ اس طرح ۸۴۳ھ میں اطالیہ میں مسلمان مسلمانوں کے خلاف لڑ رہے تھے، ان تازہ دم فوجوں کا سپہ سالار حقیقت میں کوئی بھی نہیں تھا، کیونکہ وہ کسی بڑی ہمسایہ اسلامی سلطنت سے وابستہ نہیں تھیں۔ لیکن انھیں فوجوں کی مدد سے اسکو نولف نے اپنے مخالف کو شکست دے کر بنی ونت کا محاصرہ شروع کیا، اور اس طرح اپنی فوجی قابلیت کا ثبوت دیا۔ لیکن وہ مشکلات سے اس طرح گھرا ہوا تھا کہ شہر کا بخوبی محاصرہ نہ کر سکا، اس لئے گزشتہ حالات بدستور جاری رہے۔ میسار اپنے مسلمانوں کو لئے ہر وقت لوٹ مار کرتا پھر رہا تھا، اور شمالی علاقوں تک پہونچنے کی جد و جہد کر رہا تھا۔

صرف باری اور بنی ونت کی فوجوں نے ہی اس بدقسمت ملک کو اپنا آماجگاہ اور شکار نہیں بنایا تھا۔ سمندر کی طرف سے بھی مغربی ساحل کے بڑے بڑے بندرگاہ ان اچانک حملوں کا شکار ہوتے رہتے تھے۔ کیونکہ ۸۴۵ھ میں اہل صقلیہ نے پونزا اور اِیشیا کو اپنا فوجی صدر مقام منتخب کیا تھا، اور ان شہروں سے وہ بہت جلد راس میسنو پر قابض اور متصرف ہو گئے تھے۔ نیپلز، گیتا، املفی اور سورنت کے شہروں نے بچاؤ کی خاطر اُسے غنیمت سمجھا تھا کہ ایک اتحاد قائم کرلیں، لیکن سلرنو کا ڈیوک ان کی مدد کرنے کی طرف مائل نہیں تھا۔ آئندہ سال کے لئے

مسلمان ایک زبردست جنگ کی تیاری کر رہے تھے۔ مدتوں سے ان کی للچائی ہوئی نظریں قدیم رومہ کے خزانوں سے بھرے ہوئے کلیساؤں پر پڑ رہی تھیں۔ ۲۳ اگست ۸۴۶ء تہتر جہازوں کا ایک بیڑا جس میں تقریباً گیارہ سو مسلمان تھے، اوستیا کے سامنے ظاہر ہوا۔ ۲۶ اگست کی صبح کو مسلمان رومہ کی دیواروں کے نیچے آموجود ہوئے۔ انھوں نے شہر کے باہر کے حصوں کو دل کھول کر لوٹا، بالخصوص سنت بطرس اور سنت پالوس کے کلیساؤں کو، اور "حواریوں" کی قبریں تک کھود پھینکیں۔ افسوس ہے کہ اس واقعے کی پوری تفصیل معلوم نہیں، اور جو کچھ علم میں ہے اُس میں طرح طرح کے افسانے اس قدر مل جل گئے ہیں کہ وہ علم بے کار ہے اور ان حکایات اور افسانوں سے استفادہ کرنا ناممکن ہے۔ لیکن عیسائی اپنے متبرک اور مقدس مقام کی اس بے حرمتی کو نہیں دیکھ سکتے تھے اور سمجھتے تھے کہ خدا خود مسلمانوں سے اس کا بدلہ لے گا، اور ایسا ہی ہوا۔ مسلمان روما کی لوٹ کھسوٹ کے بعد گیتا گئے، اور وہاں ایک فتح حاصل کر کے واپس ہوئے۔ لیکن ان کا بیڑا، مع تمام بیش قیمت مال غنیمت کے ساحل بحر پر ہی ایک طوفان کے نذر ہو گیا (۸۴۷ء)۔

اس واقعے کے بہت اہم نتائج ہوئے۔ ۸۴۷ء میں بادشاہ لدوگ جنوبی اطالیہ پہونچا، اور بنی ونت کو مسلمانوں سے فتح کر لیا۔ مختلف فریقوں کے ساتھ مل کر ان سب سے اُس نے عہد لیا کہ وہ باری اور ترنت کے "کفار" کے خلاف عام جنگ کرینگے لیکن یہ اچھی تجویز جنوبی اطالیہ کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے اختلافات کی وجہ سے بار آور نہ ہو سکی، اور مسلمانوں کی مسلسل بحری یورشوں کے خلاف کچھ بھی نہ کیا جا سکا۔ سب سے پہلے، جب ۸۴۹ء میں مسلمان رومہ کے خلاف ایک زبردست یورش کی تیاریاں کر رہے تھے، اور اس مقصد کے لئے سردانیہ میں جمع ہو رہے تھے، تو مغربی ساحل کے شہروں نے رومہ کے خزانوں کو بچانے کے لئے ایک اتحاد قائم کیا۔ اوستیا کے سامنے دونوں بیڑے مقابل ہوئے۔ لیکن ابھی گھمسان کی لڑائی مشکل سے شروع ہوئی ہی تھی کہ طوفان آ گیا۔ بحری جنگ اور صقلیہ کا بیڑا دونوں اچانک ختم ہو گئے، اطالوی بیڑا بھی اس طوفان میں ضرور ختم ہو گیا ہو گا، گو اس کے متعلق ہمیں کوئی اطلاع نہیں ہے۔ بہرحال

اس طرح مقدس شہر رومہ خطرے سے بچ گیا۔ آج تک ریفیل کی تصویروں اور ویتیکن کی مُہر میں اس واقع کی یاد تازہ ہے۔

ان بحری مہموں کے متعلق طرح طرح کے افسانے مشہور ہونے لگے، اور مسلمانوں کا مستحکم قلعبند شہر باری ایک مستقل خطرہ بن گیا۔ بادشاہ لدوگ نے جو فتوحات حاصل کی تھیں، وہ اُس کی واپسی پر سب ہاتھ سے نکل گئیں۔ باری کی فوجی قوت کا اثر بنی ونت تک پہنچا۔ اس لئے لدوگ کو، جسے ابھی قیصر بنا کر اُس کی تاج پوشی کی گئی تھی، ایک مرتبہ پھر جنوبی اطالیہ پر فوج کشی کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ اس دفعہ اُس نے باری کے خلاف فوج کشی کی، لیکن اُسے فتح نہ کر سکا، کیونکہ اُس کی ماتحت ریاستوں نے اسے مدد دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد اُس نے بنی ونت فتح کیا اور مسلمانوں کے سردار مسار کو، جس کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے، شکست دی (۲۸ مئی ۸۵۲ء)۔ صقلیہ کے سپہ سالار اور حاکم عباس بن فضل نے قلبریہ کے ساحل کو لوٹا اور اُسے فتح کر کے بنی ونت کا بدلہ لے لیا۔

لدوگ کی پہلی فوج کشی کے بعد جو کچھ ہوا تھا، وہی اس وقت پیش آیا۔ اس اثناء میں خلفون کی جگہ مُفرّج بن سالم باری پہنچ چکا تھا۔ اُس نے بہت جلد تمام گزشتہ شکستوں کا بدلہ لیا، اور ایک خود مختار سلطنت کی بنیاد ڈالی، کیوں کہ وہ براہ راست عباسی خلیفہ کا بھیجا ہوا تھا۔ اُس کے جانشین نے سلطان کا لقب بھی اختیار کر لیا، اور اس طرح صقلیہ سے بالکل بے تعلقی کا اعلان ہو گیا۔ باری کے ان حکمرانوں کے متعلق ہمارے معلومات بہت ہی کم ہیں۔ یہ سب کے سب مصر کے ممالک کی طرح سپاہی حکمران تھے۔ تمام ملک بلا مزاحمت کے ان کے قدموں میں پڑا ہوا تھا۔ کیونکہ پرانی ریاست بنی ونت میں انتشار اور ابتری روز افزوں تھی، اور مسلمانوں کی مزاحمت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ یورپ کے مورخ ان حکمرانوں کی ایسی ایسی خون چکاں داستانیں بیان کرتے ہیں جن کا اعتبار کرنا مشکل ہے۔ کوپوآ اور نیپلز کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی اور زیادہ شمال کی طرف دولت مند خانقاہیں تھیں، مثلاً سنت ونسنت، جو فولترنو میں واقع تھی، اور مونت کسینو کو بھی ان سے سابقہ پڑتا تھا، اور مسلمان اکثر یا نوان میں داخل ہو جاتے تھے،

یا ان کی دیواروں کے نیچے تک پہنچتے تھے۔

اس زبردست مصیبت سے نبٹنے کے لئے قیصر لدوگ نے ۸۶۶ء میں ایک مرتبہ پھر مسلمانوں کے خلاف ایک مہم بڑے پیمانے پر تیار کی، اور پھر کوشش کی کہ باری اور ترنت سے مسلمانوں کو بے دخل کر دے۔ لیکن باری کی فتح کے لئے اُسے ایک بیڑے کی ضرورت تھی۔ آخر بڑی طول و طویل گفت و شنید اور نامہ و پیام کے بعد بازنطینیوں نے ایک بیڑہ اس کے حوالے کیا۔ دونوں مشرقی اور مغربی قیصروں اور ان کی ماتحت ریاستوں کے اتحاد سے آخر ۲ر فروری ۸۷۱ء کو باری کی قوت کا طلسم ٹوٹا۔ اس سے فارغ ہو کر لدوگ ترنت کی طرف روانہ ہوا، تاکہ مسلمانوں کے آخری ملجا و ماوٰی سے بھی انھیں بے دخل کر دے۔ لیکن اب اسے انھیں حکمرانوں کی غداری سے سابقہ پڑا جنھیں اُس نے بدترین مصائب سے نجات دلائی تھی۔ ناچار لدوگ روتا کی طرف واپس چلا گیا۔ فوراً ہی مسلمان پھر وہاں ظاہر ہوئے، اور اس مرتبہ مغربی ساحل پر یا انھوں نے سلرنو کو دھمکی دی اور رکوپو آتک بڑھتے چلے گئے۔ ایک مرتبہ پھر لدوگ نے اپنے ہم مذہبوں کو مدد دی، اور رکوپو آکے قریب مسلمانوں کو شکست دی۔ اس پر انھوں نے اطالیہ کو خیرباد کہا، لیکن یہ صرف اس لئے تھا کہ زیادہ قوت کے ساتھ وہاں واپس آئیں۔ اس کے بعد لدوگ پھر کبھی جنوب کی طرف نہیں آیا۔ ۸۷۵ء میں اس نے شمالی اطالیہ میں وفات پائی، اور اس کی موت پر اس کی تمام فتوحات کے نتائج مشتبہ معلوم ہونے لگے۔

اب بازنطینی اخلاقی لحاظ سے کورولنجی خاندان کے وارث بنے، اور انھوں نے ان کے کارناموں سے بھی فائدہ اٹھایا اس کے بعد مسلمانوں سے جو لڑائیاں ہوئیں، اور جس طرح انھیں بالآخر اطالیہ سے نکالا گیا، ان سب واقعات کا تعلق بازنطینی تاریخ کے اس دور سے ہے جب وہاں مقدونی خاندان قائم ہوا، یہاں اطالوی سرزمین سے مسلمانوں کے نکالے جانے کی ایک مختصر داستان بیان کر دینا کافی ہو گا۔ بازنطینیوں نے جو اس وقت سرقوسہ پر قابض تھے، باشندوں سے اتحاد کر کے 'باری کا محاصرہ کیا۔ ۸۷۸ء میں سرقوسہ کا ہاتھ سے نکل جانا درحقیقت ایک بہت بڑی بدقسمتی تھی۔ اب تک

قلبریہ اور ترنت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھے، اور اور یہ کی حالت بھی خطرے سے خالی نہیں تھی۔ سب سے پہلے قیصر بازیل اول نے مسلمانوں پر ایک ضرب کاری لگانے کے لئے قلبریہ میں اترنے، پھر ۸۸۰ء میں ترنت فتح کرنے اور پھر چند ہی سال بعد قلبریہ کے باقی ماندہ علاقے سے مسلمانوں کو بے دخل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس طرح جنوبی اطالیہ پھر ایک مرتبہ بازنطینی سلطنت کا ایک حصہ بن گیا۔ بعد کے زمانے میں مسلمانوں کی یورشیں محض ایک افسانہ بن کر رہ گئیں، جب کہ صقلیہ کے ساحلی شہر بھی خراج ادا کر رہے تھے۔ سب سے بڑھ کر بات یہ تھی کہ مسلمانوں اور بازنطینیوں کی مسلسل جنگیں اس وقت تک ختم نہیں ہوئیں جب تک کہ نارمنوں نے ان دونوں دشمنوں پر فتح نہیں پالی۔

باری کی فتح سے وسطی اطالیہ میں مسلمانوں کے حملوں کا مرکز قدرتی طور پر برباد ہو گیا۔ اب وہ صرف مغربی ساحل سے ملک میں آتے تھے۔ لنگوبرو کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں، بہت سے تلخ تجربوں کے بعد اب زیادہ عقلمند ہو گئی تھیں۔ انھوں نے اہل صقلیہ کے ساتھ ایک عہدنامہ کر لیا تھا، جس کے مطابق ۸۷۵ء میں اہل صقلیہ نے خصوصیت کے ساتھ شمال کی طرف یورشیں شروع کیں، اور پوپ کا ناک میں دم کر دیا۔ آخر ۸۷۸ء میں پوپ جان ہشتم نے مجبوراً مسلمانوں کو خراج دینا منظور کیا، تاکہ اس کی سلطنت کو تھوڑی مدت کے لئے چین نصیب ہو جائے۔ اس کے چند سال بعد مسلمانوں نے پھر ایک مرتبہ ساحل اور براعظم کے اندرونی حصہ میں چند مفید مطلب مقامات حاصل کر لئے۔ یہ مقامات بنی ونت کے شمال اور گارگلینو کے داہنے کنارے تراجیتو کے قریب تھے۔ موخر الذکر مقام سے بے شمار تاراجی مہمیں وسط اطالیہ کو بھیجا کرتے تھے، جو روما کے دروازوں تک پہنچتی تھیں۔ مونت کسینو تک ابھی تک وہ نہیں پہونچے تھے۔ لیکن اب ایک تاراجی یورش میں انھوں نے اسے بھی لوٹا اور منہدم کر دیا سب سے پہلے ۹۱۵ء میں پوپ جان کی کوشش اور اشتعالک پر گارگلینو کو منہدم کیا گیا۔ اس کے بعد اطالیہ سے مسلمانوں کی حکومت بالکل اٹھ گئی اور اب صرف ساحل بحر پر چھاپوں کے حالات

سننے میں آتے ہیں ۔

جنوبی اطالیہ پر مسلمانوں کی بے نتیجہ یورشوں کے بعد اب ہمیں صرف ان واقعات کا ذکر کرنا چاہیئے جو صقلیہ اور سرزمین یورپ میں پیش آرہے تھے ۔لیکن ہم یہاں جس بات پر زیادہ زور دینگے وہ ان دونوں مقامات کے واقعات کا تعلق ہے نہ کہ ان واقعات کی تفصیل۔بعد کے زمانے کے واقعات قدرتی طور پر خود صقلیہ کی خاص تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں۔اس عرصے میں صقلیہ کی حکومتِ اعلیٰ بدل چکی تھی۔فاطمیین کے خلیفہ مہدی نے بنو اغلب کی سلطنت کے مختلف حصے جوڑ کر ایک ایسی سلطنت قائم کرلی تھی جس میں آئندہ ترقی کرنے کی صلاحیت تھی۔صقلیہ کے عرب اور بربری کم از کم ظاہری طور پر اب مل جل گئے تھے' اور ان نئے حالات کی وجہ سے جو ان کے وطن' شمالی افریقہ میں پیدا ہوگئے تھے' صقلیہ میں برسرپیکار نہیں تھے (۹۱۰ء)' لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ خلیفۂ مہدی کے بھیجے ہوے حاکم صقلیہ نے وہاں کے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔۹۱۳ء میں صقلیہ کے مسلمانوں نے اپنے عرب امیر' احمد بن قرہب' کی ماتحتی میں اپنی خودمختاری کا اعلان کیا' اور فاطمیین کی جگہ عباسی خلیفہ کا نام خطبے میں لینا شروع کیا۔لیکن عربوں اور بربریوں کا اتحاد بہت دن تک قائم نہ رہ سکا۔۹۱۶ء ہی میں بربریوں نے بدقسمت امیر احمد بن قرہب خلیفہ مہدی کے حوالے کردیا۔جس نے اُسے سخت عذاب دے کر قتل کرادیا۔۹۱۷ء میں صقلیہ ایک مرتبہ پھر خلافت فاطمیین کا جزو بن گیا۔

خلافت فاطمیین کے استحکام کے بعد ہی افریقہ اور صقلیہ سے بحری مہموں کا آغاز ہوا۔ لیکن بازنطینیوں نے مہدی سے معاہدہ کرکے کچھ مدت کے لئے اپنے ساحلوں پر امن برقرار رکھا۔اب بھی مسلمان بالکل بلاخوف مزاحمت شمال میں پوری طرح آزاد تھے۔چنانچہ ۹۳۵ء اور ۹۳۶ء میں انھوں نے جنوا کے علاقے بلکہ خود اس شہر کو تاخت و تاراج کیا' اور اس کے علاوہ لورسیکا اور سروانیہ بھی ان کے ہاتھوں سے نہ بچے۔

یہ مدت صقلیہ کے لئے کچھ موافق مرام نہ تھی۔ایک ناعاقبت اندیش حاکم نے اپنی

بے پروائیوں سے اسلامی حکومت کو شورشوں اور بغاوتوں میں مبتلا کر دیا، اور ایک دوسرے حاکم نے اُسے خونریز جھگڑوں میں پھنسا دیا۔ لیکن اس کے بعد ہی ایک عرب امیر حسن بن علی کے زیر انتظام صقلیہ کا بہترین اور مبارک ترین عہد شروع ہوا۔ حسن بن علی ۹۴۷ء میں فاطمی خلیفہ ابوالقاسم کی طرف سے صقلیہ کا حاکم مقرر ہوا۔ وہ بنو ابوالحسین کے کلبی خاندان سے تعلق رکھتا تھا، اس وجہ سے خود حسن بن علی، اور ان لوگوں کو جو حکومت میں اُس کے جانشین اور رشتہ دار تھے کلبی کہا جاتا ہے۔ یہ نہایت نمایاں اور مشہور خاندان ہے، جس کے عہد میں صقلیہ نے تہذیب و تمدن کے ہر شعبے میں نمایاں ترقی کی، جسے نارمنوں نے جاری رکھا، اور جسے فریڈرک ثانی نے ایک خاص شکل دے دی۔

اس حوصلہ مند امیر حسن بن علی نے ان تمام عناصر کو جو اتحاد اور یک جہتی میں سد راہ تھے، اپنی مصلحت اندیشی اور دانشمندی سے زیر کیا، اور ایک باضابطہ حکومت کی بنیادیں استوار کرنے کی کوشش کی۔ فاطمیین کو بھی جب کبھی نئے امیر صقلیہ کی ضرورت ہوئی تو انھوں نے بھی بجائے اس طاقتور خاندان بنو ابوالحسین سے بگاڑ پیدا کرنے کے یہی بہتر سمجھا کہ انھیں کے خاندان سے نیا امیر منتخب کر لیا جائے، اور ہر امیر کو یقین دلایا کہ اُس کا خود مختارانہ رویہ قابل اعتراض نہیں ہے۔ بہرحال حسن بن علی ہر لحاظ سے خود مختار تھا، خصوصاً اُس وقت جبکہ فاطمیین کا مرکز ثقل مصر کی طرف منتقل ہو رہا تھا۔ اس لحاظ سے خلیفہ کا امیر اب لازمی طور پر امیر قیروان کے مقابلے میں توازنِ قوت کے لئے زیادہ اہم حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ فاطمیین کی خارجی سیاسیات میں بھی صقلیہ نے مدتوں تک ایک نمایاں حصّہ لیا، خصوصاً اس لحاظ سے کہ اس وقت مشرقی بحیرۂ روم میں فاطمیین اسلامی سطوت و قوت کے سب سے بڑے نمائندے تھے، اور غلبہ اور استیلا حاصل کرنے کے لئے بازنطینیوں سے مسلسل لڑ رہے تھے۔ یہ تمام واقعات ہمارے زیر بحث موضوع کے احاطے سے باہر ہیں۔ ان کا محض ضمناً ذکر کر دینا کافی ہے، مگر ان کے تفصیلی حالات یہاں بیان نہیں کئے جا سکتے۔

حسن بن علی نے ۹۶۵ء تک حکومت کی۔ اس کے عہد حکومت میں قلبریہ اور اپولیہ میں نئے سرے سے جنگیں شروع ہوئیں، اور بازنطینیوں نے صقلیہ میں فوجیں اتارنے کی کوشش کی۔ ۹۶۵ء میں سینا کے قریب رومی بیڑہ مکمل طور پر تباہ ہوگیا۔ اب چونکہ اسی وقت فاطمیین مصر کی فتح کی تیاری کر رہے تھے، اور اس فتح کا وقت قریب آگیا تھا، اس لئے انھوں نے بازنطینیوں کے ساتھ صلح کرلی۔ اسی وجہ سے اطالیہ کو بھی مسلمانوں کی طرف سے اطمینان نصیب ہوا، بلکہ یہی صلح ایک اتحاد کا باعث ہوئی، کیونکہ اسی زمانہ میں خاندان آتو کی طرف سے نقل و حرکت شروع ہوئی۔ ۹۸۲ء میں آتو دوم نے خلیج ترنت میں ستلو کے قریب بری طرح شکست کھائی۔

لیکن بہت جلد یہ عجیب و غریب اور غیر معمولی صلح ختم ہوگئی، اور سنہ ۱۰۰۰ء سے دس سال پہلے اور اس کے دس سال بعد ہم پھر دیکھتے ہیں کہ کلبی امیر جنوبی اطالیہ میں دوبارہ موجود ہیں۔ لیکن خواہ کچھ ہو بہر حال صقلیہ کے باشندوں نے ان قابل امیروں کے تحت ایسی مرفہ الحالی اور فلاح و بہبود حاصل کی جس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ ان امیروں کے عہد میں خوش حالی انتہا کو پہنچی۔ اُس زمانے کے مشرق میں جو مادی ترقی اور مرفہ الحالی اس وقت پائی جاتی تھی اُس کا ذکر یہاں نہیں کیا جاسکتا، اور نہ اس اعلیٰ درجہ کی معاشرت کا ذکر کیا جاسکتا ہے جو اُس وقت وہاں عام تھی۔ صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ ان امیروں کے زمانے میں بلرم ایک چھوٹے پیمانے پر بغداد، قرطبہ اور قاہرہ کا مقابلہ کرتا تھا۔ مگر یہ عروج کا زمانہ امیر یوسف تک رہا (۹۸۹ء۔ ۹۹۸ء) یوسف کے بعد ہی زوال کے آثار شروع ہوگئے، کلبی خاندان اب اپنے انتہائی عروج پر پہنچ چکا تھا۔ صرع میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے یوسف حکومت کے قابل نہ رہا تھا۔ اس کا بیٹا حالات پر قابو نہ پاسکا۔ عربوں اور بربریوں کے اختلاف اندر ہی اندر سلگ رہے تھے، اب اچانک بھڑک اٹھے۔ جو بغاوت ہوئی اس کا انجام یہ ہوا کہ بربریوں کو نکال باہر کیا گیا، اور امیر کا ایک بھائی، جو بربریوں کا سرغنہ بن گیا تھا، قتل کیا گیا۔ ایک اور بھائی کا مقابلہ جعفر سے نہ ہوسکا اور اُسے زیر ہو جانا پڑا۔ اندرون ملک کی کمزوری کی وجہ سے اصل صقلیہ مختلف بحری فوتوں،

مثلاً قسطنطنیہ اور پیسا کی بھی مقاومت اور مزاحمت نہ کر سکے، حالانکہ یہ بحری قوتیں ہر طرف انھیں دھمکیاں دے رہی تھیں۔ سنہ ۱۰۰۰ء کے شروع میں صقلیہ کے بیڑے کو مختلف شکستیں برداشت کرنی پڑیں۔ جب زیری خاندان اور اہل صقلیہ میں اتحاد قائم ہوا اور زیری ان کے حلیف بنے تو انھیں سنہ ۱۰۲۰ء سے سنہ ۱۰۳۰ء تک دوبارہ اس کی ہمت ہوئی کہ بازنطینی علاقوں پر یورشیں کریں، لیکن ان یورشوں کا انجام بھی شکستوں پر ہوا۔

ان ناکامیوں کا آخر نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۰۳۵ء میں خود اہل ملک میں خانہ جنگی شروع ہو گئی، اور اسی جنگ و جدل کی وجہ سے نہ صرف کلبی خاندان بلکہ صقلیہ میں اسلامی حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس مرتبہ جنگ کی آگ عربوں اور بربریوں میں نہیں بھڑکی، بلکہ یہ جنگ نتیجہ تھی اس امر کا کہ بربریوں کو ملک سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔ اس حالت میں بربریوں کے لئے ضروری ہوا کہ فوجیں جمع کر کے جو کچھ کھو چکے تھے اُسے دوبارہ حاصل کریں۔ اس کے لئے رقم کی ضرورت تھی، اور رقم کے حصول کے لئے محاصل میں اضافہ کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صقلیہ کے باشندے، جو پہلے ہی تنگ آ گئے تھے، جنگ کے لئے تیار ہو گئے۔ اب امیر احمد نے بازنطینیوں کو اپنی مدد کے لئے بلایا، اور دوسری طرف باغیوں نے جن کا سرغنہ خود امیر کا بھائی تھا، زیریوں سے مدد مانگی۔ بازنطینی فوج میں بے شمار نارمن شریک تھے۔ بہر حال بازنطینی سپہ سالار منیاکیس نے سنہ ۱۰۳۸ء سے سنہ ۱۰۴۰ء تک برابر جنگیں جیتیں۔ لیکن اس کی فوج میں پھوٹ پڑی، نارمنوں کو قابو میں رکھنا پہلے ہی مشکل ہو رہا تھا، اب وہ بالکل ہاتھ سے نکل گئے۔ آخر منیاکیس اور بیڑے کے بازنطینی سپہ سالار ستیفنوس دونوں کو نارمنوں نے بالکل بے دخل کر دیا۔ اس طرح بازنطینیوں نے اپنی فتوحات کھو دیں۔ یہ واقعات سنہ ۱۰۴۲ء تک پیش آئے۔ اس عرصے میں خود صقلیہ کے باشندے زیری افواج سے تنگ آ گئے تھے، کیونکہ اس فوج کے مطالبات برابر بڑھتے جا رہے تھے اور کسی طرح ختم نہ ہوتے تھے۔ اس لئے اہل صقلیہ نے انھیں اپنے ملک سے نکال دیا۔ اب موقع تھا کہ کلبی خاندان کی حکومت

ایک مرتبہ پھر مستحکم ہو جائے۔

لیکن اب تک جو ایک عام جنگ ہو رہی تھی، اور ہر شخص دوسرے سے دست و گریباں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ مختلف حاکموں اور شہروں نے اپنی آپ مدد کرنے کا گر سیکھ لیا تھا۔ اس لئے اس عظیم الشان جنگ کے بعد معلوم ہوا کہ صقلیہ کا سیاسی اتحاد ختم ہو چکا ہے، بلکہ اس کی جگہ اب چھوٹے چھوٹے حکمرانوں اور جمہوریتوں نے لے لی ہے۔ طوائف الملوکی کا دور شروع ہوا، اور ہر ریاست دوسری ریاست سے برسرپیکار ہوئی۔ ان میں زبردست اور مسلسل جنگ جاری تھی، اور اس کی وجہ سے باشندوں میں بھی جنگیں ہو رہی تھیں۔ ان میں مخالف فریق عرب امرا کی جماعتیں اور صقلیہ کے وہ مفتوحہ باشندے تھے جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ عرب امرا کے قبضے میں سرقوسہ تھا اور موخر الذکر گرگنتی اور کستروگووانی پر قابض و متصرف تھے۔ عربوں کا سرکردہ ابن الثمنا نامی ایک شخص تھا۔ مخالف فریق سے شکست کھا کر ابن الثمنا نے ۱۰۶۱ء میں نارمنوں سے مدد مانگی۔ نارمن اس عرصہ میں براعظم یورپ میں ایک زبردست سلطنت قائم کر چکے تھے۔ ۱۰۹۱ء میں نارمنوں کی فتح صقلیہ مکمل ہو گئی۔ اس کی تفصیل بیان کرنے کی یہاں ضرورت نہیں۔

اس فتح سے یورپ میں اسلام کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ عربوں کی توسیع اب اپنے انتہائی عروج کو پہنچ چکی تھی، اور رفتہ رفتہ انھیں افریقہ سے بھی بے دخل کیا جا رہا تھا۔ اندلس میں بے دخلی کا یہ عمل اور چند صدیوں تک جاری رہا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت یہاں بھی محض ایک افسانہ رہ گئی تھی۔ وہ تمدنی برکتیں، جن کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اسلام کی وجہ سے یورپ مستفید ہوا اتنی ہی کم ہیں جتنی کہ حروب صلیبیہ سے حاصل ہونے والی برکتیں تھیں۔ مگر اس کے برعکس جنوبی یورپ کو مسلمانوں سے جو نقصان پہنچا، اس کے بیان کرنے میں مبالغہ ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ مسلمانوں سے یورپ کو اس سے زیادہ اور کیا نقصان پہنچ سکتا تھا کہ انھوں نے اُس وقت یورپ کی بحری ترقی روک دی اگر صرف کلیسائی نظر سے دیکھا جائے تو مذہب پر بھی ان کی یورشوں کا بہت ہی بُرا اثر پڑا۔

پیشہ وری تعلیم[1]

(از جناب ملک سردار علی خاں صاحب ریڈر ٹریننگ کالج حیدرآباد (دکن))

آج کل کی روز افزوں بے روزگاری اور اقتصادی خرابیوں کی تمامتر ذمہ واری ہمارے نظام تعلیم پر عاید کی جارہی ہے کہ اس میں ادبی تعلیم کا عنصر بہت زیادہ ہے اور آئندہ زندگی کے لئے موزوں پیشوں اور دھندوں کی تربیت کی جانب کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔ اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ تر ایسے علمی و ادبی مضامین کو شامل نصاب کیا جاتا ہے۔ جو عملی زندگی سے کچھ زیادہ ربط وتعلق نہیں رکھتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وقت وزر کی اس قدر خرابی کے بعد جب طلباء ان تعلیمی اداروں سے فارغ ہوکر عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو اپنے تئیں ایک طرح کی بےبسی و بےچارگی میں گھرا ہوا پاتے ہیں۔ اسی بناء پر آجکل تمام سنجیدہ افراد موجودہ نظام تعلیم کی مذمت کرتے اور اسے حقیقی زندگی سے بے ربط قرار دیتے ہیں۔ اور بڑے اصرار سے صنعتی وفنی تعلیم کی ترویج پر زور دیتے ہوئے نئی نئی تعلیمی اصلاحات کے لئے پرچار کرتے ہیں۔ دریں حالات موجودہ زمانہ میں ہر علم اور تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے شہری کے لئے یہ لازم ہوجاتا ہے۔ کہ ایسے اصلاحی معاملات اور تعلیمی مسائل سے بخوبی واقف و آگاہ رہے۔ چنانچہ اسی لئے ہم یہاں پر ذرا تفصیل سے اس عنوان پر بحث کرینگے اور دیکھیں گے کہ پیشہ وری تعلیم کا

(۱) جناب ملک سردار علی خاں صاحب کا یہ مضمون ان کی کتاب "اصول تعلیم" کا ایک حصہ ہے۔ یہ کتاب عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ امید ہے کہ اردو داں پبلک اس کتاب کی قدر کرے گی۔ اڈیٹر